## معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۲۰/روپے    فی شمارہ ۱۲/روپے

پاکستان میں سالانہ ۳۰۰/روپے

دیگر ممالک میں سالانہ    ہوائی ڈاک پچیس پونڈ یا چالیس ڈالر

بحری ڈاک نو پونڈ یا چودہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:    حافظ محمد یحییٰ، شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج اسٹریچن روڈ، کراچی۔

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

**DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH**

☆ رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کی ۱۵ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع ماہ کے تیسرے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہئے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔




# فہرست ششماہی

## مضمون نگاران معارف

۱۷۱ ویں جلد

ماہ جنوری ۲۰۰۳ء تا ماہ جون ۲۰۰۳ء (بہ ترتیب حروف تہجی)


| نمبرشار | مضمون نگار | صفحات | نمبرشار | مضمون نگار | صفحات |
|---|---|---|---|---|---|
| ۱۔ | جناب ابوسفیان صاحب اصلاحی | | ۱۴ | پروفیسر شریف حسین قاسمی صاحب | |
| | لکچرر شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ | ۲۷۰ | | شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی، دہلی | ۲۱۸ |
| ۲۔ | پروفیسر احتشام احمد ندوی سابق صدر | | ۱۵ | ڈاکٹر صبیحہ سلطانہ خان صاحبہ علیگڑھ | ۴۴۱ |
| | شعبہ عربی کالیکٹ یونیورسٹی، کیرالہ | ۳۴۴ | ۱۶ | ضیاء الدین اصلاحی | ۲،۸۲، |
| ۳۔ | جناب احمد بن محارب الظفیری صاحب | ۲۹۶ | | | ۱۲۲،۲۲۵ |
| ۴۔ | ڈاکٹر احمد نسیم صاحب | | | | ۲۲۶،۲۲۸ |
| | ریڈر شعبہ عربی لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ | ۲۹۶ | | | ۲۲۹،۲۴۲ |
| ۵۔ | جناب اقبال ردولوی صاحب | | | | ۳۲۲،۴۰۲ |
| | درگاہ ردولی، فیض آباد | ۴۷۲ | | | ۴۰۵،۴۷۳ |
| ۶۔ | جناب انتظار نعیم صاحب، | | ۱۷ | ضیاء الرحمٰن اصلاحی، دارالمصنفین | ۱۱۹ |
| | بارہ دری بلی ماران، دہلی | ۳۹۵ | ۱۸ | ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی صاحب | |
| ۷۔ | جناب انوار احمد صاحب | | | ریڈر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مسلم | |
| | سابق پروفیسر پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ | ۲۰۵ | | یونیورسٹی علی گڑھ | ۲۰ |
| ۸۔ | جناب انیس چشتی صاحب، پونے | ۵۳ | ۱۹ | ڈاکٹر ظفر الدین صاحب | |
| ۹۔ | جناب اورنگ زیب صاحب | | | کچھی باؤلی، حیدر آباد | ۲۱۵ |
| | غفار منزل جامعہ نگر نئی دہلی | ۳۷۱ | ۲۰ | پروفیسر عبدالاحد رفیق | |
| ۱۰۔ | ڈاکٹر جاویدہ حبیب صاحبہ | | | نزد سٹیل فیکٹری، اپر صوزہ، سرینگر | ۳۰۵ |
| | امیر النساء بیگم اسٹریٹ، چنئی | ۴۶۵ | ۲۱ | ڈاکٹر عبدالرب عرفان مرحوم صاحب | |
| ۱۱۔ | جناب حماد ظفر سلفی صاحب، مئو | ۳۳۴ | | غالب روڈ، وارث پورہ، کامٹی، ناگپور | ۳۳ |
| ۱۲۔ | پروفیسر خورشید نعمانی صاحب، ممبئی | ۷۲ | ۲۲ | پروفیسر عبدالرحمٰن مومن صاحب | |
| ۱۳۔ | جناب رئیس احمد نعمانی صاحب | ۷۱،۲۳۰ | | صدر شعبہ عمرانیات ممبئی یونیورسٹی | ۴۵۸ |
| | لوکو کالونی (نئی آبادی) علی گڑھ | ۳۹۱ | ۲۳ | جناب عبدالقدیر صاحب، الٰہ آباد | ۴۷۲ |

| نمبرشمار | مضمون نگار | صفحات | نمبرشمار | مضمون نگار | صفحات |
|---|---|---|---|---|---|
| ۲۴ | جناب حافظ سید عزیز الرحمن صاحب | | ۳۵ | پروفیسر محمد ولی الحق انصاری | |
| | نائب مدیر ششماہی السیرۃ عالمی، کراچی | ۱۰۱ | | صاحب، فرنگی محل، لکھنؤ | ۷۳ |
| | جناب علیم صبا نویدی صاحب | | ۳۶ | پروفیسر یسین مظہر صدیقی صاحب | |
| ۲۵ | امیر النساء بیگم اسٹریٹ، چینئی ۲، | ۵۹ | | ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ | ۱۷۱،۸۵ |
| | ڈاکٹر عمر [illegible] صاحب | ۳۷۱ | ۳۷ | جناب مظہر الاسلام صاحب قاسمی | |
| ۲۶ | حافظ عمیر الصدیق دریابادی ندوی | ۱۵۶،۷۵ | | جے نگر، نیل باغان نوگاؤں، آسام | ۳۹۳ |
| | رفیق دار المصنفین، اعظم گڑھ | ۲۳۱،۱۸۹ | ۳۸ | ڈاکٹر معتصم عباسی آزاد صاحب | |
| | | ،۳۱۹،۲۳۴ | | سابق استاذ شعبہ فارسی مسلم | |
| | | ۳۹۷ | | یونیورسٹی علی گڑھ | ۲۴۵ |
| ۲۷ | ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین ربانی صاحب | | ۳۹ | جناب مقبول احمد صاحب | |
| | محکمہ آثار قدیمہ ہند، ناگپور۔ | ۴۵۲ | | کناڈا | ۴۷۱ |
| ۲۸ | جناب کلیم صفات اصلاحی اسکالر | ۳۹۰،۳۱۲ | ۴۰ | ڈاکٹر حافظ منیر احمد خاں صاحب | |
| | دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ | ۴۶۹ | | اسسٹنٹ پروفیسر سندھ یونیورسٹی | |
| ۲۹ | جناب محمد امین عامر صاحب، کلکتہ | ۳۱۴ | | جام شورو سندھ، حیدرآباد | ۱۴۱ |
| | جناب محمد بدر الدین صاحب | | ۴۱ | جناب نسیم احمد صاحب | |
| ۳۰ | خدا بخش لائبریری، پٹنہ | ۴۵ | | (وائس چانسلر) علی گڑھ مسلم | |
| ۳۱ | جناب محمد بدیع الزماں صاحب | | | یونیورسٹی علی گڑھ۔ | ۳۹۳ |
| | پھلواری شریف، پٹنہ | ۷۰ | ۴۲ | جناب وارث ریاضی صاحب | |
| ۳۲ | پروفیسر محمد حسان خاں صاحب | | | کاشانہ ادب سکٹا دیوراج | |
| | برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال | ۴۲۶ | | مغربی چمپارن، بہار | ۶۵ |
| ۳۳ | مولانا محمد شہاب الدین ندوی مرحوم | | ۴۳ | پروفیسر سید وحید اشرف صاحب | |
| | صاحب فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ بنگلور | ۵ | | عائشہ اپارٹمنٹ، کلیان سوسائٹی | |
| ۳۴ | پروفیسر محمد صابر خاں صاحب | | | بڑودہ۔ | ۳۵۲ |
| | ۰ پارک اسٹریٹ، کلکتہ، مغربی بنگال | ۳۲۵ | | | |




# فہرست ششماہی

## مضامین معارف

۱۷۱ویں جلد

ماہ جنوری ۲۰۰۳ء تا ماہ جون ۲۰۰۳ء (بہ ترتیب حروف تہجی)


| نمبرشمار | مضمون | صفحات | نمبرشمار | مضمون | صفحات |
|---|---|---|---|---|---|
| ۱۔ | شذرات | ،۸۲،۲ | ۱۱ | جاہلی تہذیب | ۳۷۱ |
| | | ۲۴۲،۱۶۲ | ۱۲ | حاتم الطائی اور اس کی شاعری | ۱۸۹ |
| | | ،۳۲۲ | ۱۳ | حضرت ام ایمن ۔ رسول اکرم | |
| | | ۴۰۲ | | ﷺ کی انّا | ۱۷۱،۸۵ |
| | مقالات | | ۱۴ | حضرت ذوقی کی فارسی شاعری | ۳۵۲ |
| ۱۔ | ابان الاحقی اور اس کی شاعری | ۱۱۹ | ۱۵ | دارا شکوہ اور اس کا مخلوط مذہب | ۴۰۵ |
| ۲۔ | ابو طالب نندنی اور ان کا | | ۱۶ | سلطان محمد قلی قطب شاہ کی فارسی | ۳۳ |
| | رسالہ موسیقی | ۲۰۵ | | شاعری | |
| ۳۔ | اچل پور کی وجہ تسمیہ | ۴۵۲ | ۱۷ | سنسکرت ہندی اور مسلمان | ۴۵ |
| | اسپین ہے ترے آثار میں | | ۱۸ | شاہ سلطان ثانی | ۵۹ |
| ۴۔ | پوشیدہ، کس کی داستاں؟ | ۳۲۵ | ۱۹ | صدر الصدور شیخ عبد النبی اور ان | |
| ۵۔ | الفاروق کے فقہی مباحث | ۲۰ | | کی کتاب سنن الہدیٰ | ۴۴۱ |
| ۶۔ | انسی قندھاری عہد بابر و ہمایوں | ۲۱۸ | ۲۰ | طالبات کی اقامتی درسگاہیں | ۵۳ |
| | کا ایک فارسی شاعر | | ۲۱ | غوثی آرکائی | ۴۶۵ |
| ۷۔ | پندنامۂ عطار، احادیث کی | ۱۴۱ | ۲۲ | قرآن عظیم کے سائنٹفک دلائل | ۵ |
| | تلمیحات | | ۲۳ | قرآن میں غیر معرب الفاظ | ۳۳۴ |
| ۸۔ | ترجمان القرآن مولانا | | ۲۴ | مذہب حروفی کا سرسری جائزہ | ۲۴۵ |
| | حمید الدین فراہی کا رسالہ فی | ۲۷۰ | ۲۵ | مرحوم ڈاکٹر حمید اللہ کے ساتھ ایک | |
| | ملکوت اللہ | ۱۰۱ | | گفتگو | ۴۵۸ |
| ۹۔ | تقویم اسلامی کا آغاز | | ۲۶ | مقدمات مولانا ابوالحسن علی ندویؒ | ۳۴۴ |
| ۱۰ | جاپان میں تبلیغ اسلام اور ہندوستانی | | ۲۷ | ملا محمد اسماعیل بینش کشمیری | ۳۰۵ |
| | مسلمانوں کی مساعی | ۴۲۶ | | | |

| نمبر شمار | مضمون نگار | صفحات | نمبر شمار | مضمون نگار | صفحات |
|---|---|---|---|---|---|
| ۲۸ | مملکت آل مسیب العقیلیہ کی | | ۵ | غزل | ۴۷۲ |
| | تاریخ کے چند اوراق | ۲۹۶ | ۶ | مناجات در رباعیات | ۲۳۰ |
| ۲۹ | اخبار علمیہ | ۳۱۲،۳۹۰ | | باب التقریظ والانتقاد | |
| | | ۴۶۹ | ۱ | رسالوں کے خاص نمبر | ۲۳۱ |
| | معارف کی ڈاک | | | مطبوعات جدیدہ | ۷۵،۱۵۶ |
| ۱ | اردو یونیورسٹی | ۳۱۵ | | | ۲۳۴،۳۱۶ |
| ۲ | اظہار تشکر | ۳۹۳ | | | ۳۹۷،۴۷۳ |
| ۳ | ایک ضروری تصحیح | ۷۰ | | | |
| ۴ | بعض فروگذاشتیں | ۷۱ | | | |
| ۵ | خمرہ کا صحیح ترجمہ | ۳۹۳ | | | |
| ۶ | صحت املا | ۶۵ | | | |
| ۷ | طالبات کی اقامتی درسگاہیں | ۳۱۴ | | | |
| ۸ | مکتوب کناڈا | ۴۷۱ | | | |
| ۹ | نومبر کا معارف | ۷۲ | | | |
| | وفیات | | | | |
| ۱ | بیگم حمیدہ سلطان احمد | ۲۲۶ | | | |
| ۲ | پروفیسر انامری شمل | ۲۲۸ | | | |
| ۳ | پروفیسر سید ضیاء الحسن ندوی | ۲۲۵ | | | |
| ۴ | مولوی مفتی نسیم احمد قاسمی | ۲۲۹ | | | |
| | ادبیات | | | | |
| ۱ | تکبیر مسلسل | ۳۹۵ | | | |
| ۲ | دوغزلہ | ۷۳ | | | |
| ۳ | غزل | ۳۹۶ | | | |
| ۴ | غزل | ۴۷۲ | | | |


جلد ۱۷۱ ماہ شوال المکرم وذی قعدہ ۱۴۲۳ھ مطابق ماہ جنوری ۲۰۰۳ء عدد ۱

## فہرست مضامین


| | | |
|---|---|---|
| شذرات | ضیاء الدین اصلاحی | ۳-۴ |
| **مقالات** | | |
| قرآن عظیم کے سائنٹفک دلائل | مولانا محمد شہاب الدین ندوی مرحوم | ۵-۱۹ |
| الفاروق کے فقہی مباحث | ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی | ۲۰-۳۲ |
| سلطان محمد قلی قطب شاہ کی فارسی شاعری | ڈاکٹر عبد الرب عرفان مرحوم | ۳۳-۴۴ |
| سنسکرت، ہندی اور مسلمان | جناب محمد بدر الدین صاحب | ۴۵-۵۲ |
| طالبات کی اقامتی درس گاہیں | جناب انیس چشتی صاحب | ۵۳-۵۸ |
| شاہ سلطان ثانی | جناب علیم صبا نویدی صاحب | ۵۹-۶۴ |
| **معارف کی ڈاک** | | |
| صحت املا | جناب وارث ریاضی صاحب | ۶۵-۷۰ |
| ایک ضروری تصحیح | جناب محمد بدیع الزماں صاحب | ۷۰-۷۱ |
| بعض فروگذاشتیں | جناب رئیس احمد نعمانی صاحب | ۷۱-۷۲ |
| نومبر کا معارف | پروفیسر خورشید نعمانی صاحب | ۷۲ |
| **ادبیات** | | |
| دوغزلہ | پروفیسر محمد ولی الحق انصاری صاحب | ۷۳-۷۴ |
| مطبوعات جدیدہ | ع-ص | ۷۵-۸۰ |

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# شذرات

۱۴/ دسمبر کو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں علی سردار جعفری کی یاد میں ''ادب کی سماجی معنویت'' کے عنوان سے ایک سمینار ہوا، اس میں نائب صدر جمہوریہ بھیروں سنگھ شیخاوت مہمان خصوصی کی حیثیت سے تشریف لائے اور (۱) اردو کو مذہبی بندھنوں سے آزاد کرنے پر زور دیا (۲) اردو کے دائرے کو وسیع کرنے کے لئے اسے ہندی رسم الخط میں لکھنے (۳) اردو اور ہندی دونوں کو ایک دوسرے کے رسم الخط میں لکھنے کا چلن عام کرنے کا مشورہ دیا (۴) دوسری ہندوستانی زبانوں کو بھی اسی طرح مختلف لپیوں میں لکھے جانے کی رائے دی۔

یہ ارشادات چاہے کتنے ہی مخلصانہ اور ہمدردانہ ہوں مگر اولاً تو عزت مآب نائب صدر جمہوریہ ہند اردو سے ناواقف ہیں، جس پر انہوں نے اپنی اسی تقریر میں اظہار افسوس فرمایا، دوسرے ان کے مشوروں پر اردو کے مخالفین کی چھاپ پڑی ہوئی ہے، دراصل اردو کے مخالفین دو طرح کے ہیں ایک تو نہایت جارح اور کٹر قسم کے ہیں جو اردو کو غیر ملکی اور مسلمانوں کی زبان سمجھ کر اسے گردن زدنی سمجھتے ہیں، دوسری قسم کے مخالفین اردو کے محافظ، ہمدرد اور مخلص بن کر سامنے آتے ہیں اور اس کی بقا و تحفظ کے لئے اسے ہندی رسم خط میں لکھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

نائب صدر جمہوریہ ہند کی نیت پر اس لئے شبہ نہیں ہوتا کہ ان کے نزدیک اردو گنگا جمنی تہذیب کی نمائندگی کرنے والی ہندوستانی زبان ہے اور اسے ہندی رسم خط میں لکھنے کے ساتھ ہی ہندی کو بھی اردو رسم خط میں لکھے جانے بلکہ دوسری ہندوستانی زبانوں کو بھی مختلف لپیوں میں لکھے جانے کا انہوں نے مشورہ دیا ہے، اس کے لئے ہم ان کے شکر گزار ہیں مگر اہل نظر جانتے ہیں کہ

ع قلندری ہو، سکندری ہو یہ سب طریقے ہیں ساحرانہ، ہم کو ان کی اس رائے سے اختلاف ہے کہ اردو مذہبی بندھنوں میں گرفتار ہوگئی ہے، اردو یقیناً گنگا جمنی اور سیکولر زبان ہے اور اس کی آب یاری مسلمانوں کی طرح ہندوؤں نے بھی کی ہے اور دونوں کا مذہبی اثاثہ اس میں موجود ہے۔ قرآن مجید، احادیث نبوی، فقہ اسلامی کی کتابوں کے اردو ترجمے اور ان پر مستقل کتابیں جس طرح لکھی گئی ہیں اسی طرح ہندوؤں کی مذہبی کتابوں گیتا، رامائن اور مہابھارت وغیرہ کے بھی اردو ترجمے ہوئے اور یہ کام ہندوؤں کی طرح مسلمانوں نے بھی انجام دیا ہے، مسلمانوں کی طرح



ہندوؤں نے بھی حمد و مناجات اور نعت و منقبت کے اشعار کہے ہیں، اس طرح اردو کا ذخیرہ صرف مذہبی ادب ہی سے نہیں خالص ادب کے سرمایہ سے بھی مالا مال ہے اور اردو ہی نہیں دنیا کی ہر زبان میں ادبی و مذہبی دونوں طرح کے ذخیرے ہوتے ہیں۔

دنیا کی ہر ترقی یافتہ زبان اپنا دامن ہر قسم کے علوم و فنون کی کتابوں سے بھرنے کی کوشش کرتی ہے، اردو میں بھی سماجیات، معاشیات، نفسیات، عمرانیات، فلسفہ و سائنس اور جدید علوم و نظریات پر کتابیں نکل رہی ہیں، ایسی صورت میں اسے مذہبی بندھنوں میں گرفتار کیسے کہا جاسکتا ہے، زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، لیکن جب آزادی کے بعد اردو کو ختم کردینے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا گیا، ریاستی حکومتوں نے اس کو اپنے دفاتر سے نکال باہر کیا، روٹی روزی سے اس کا رشتہ ختم کیا، اسکولوں میں اس کی تعلیم بند کردی تو علوم و فنون پر کتابوں کی اشاعت میں بھی کمی ہونے لگی اور وہ دینی مکاتب اور عربی مدارس میں پناہ لینے کے لئے مجبور ہوگئی جو مرکزی وزارت داخلہ کے نشانے پر آگئے ہیں، اگر اس کی وجہ سے اردو کو مذہبی بندھنوں میں گرفتار سمجھا جاتا ہے تو اس کی ذمہ داری کس پر ہے؟ تاہم ان مشکل حالات میں بھی اردو کے مذہبی و ادبی ذخیرے میں برابر اضافہ ہو رہا ہے، ہندی کے غلبہ و استیلا کے اس دور میں اردو رسم خط کو بدلنا اور اردو سے غافل ہو کر اس کے سارے اثاثے کو ہندی میں منتقل کرنا اور ہندی کے لئے اردو رسم خط کو اختیار نہ کیا جانا دراصل اردو کی موت کو دعوت دینا ہے، شیخاوت صاحب نے ہندی کو بھی اردو رسم خط میں لکھے جانے کا مشورہ دیا ہے، گاندھی جی نے بھی دونوں زبانوں کو دونوں کے رسم خط میں لکھنے کا مشورہ دیا تھا مگر جب کانگریس کے رہنماؤں نے ان کی بات نہ مانی تو موجودہ حکمرانوں سے اس کی کیا توقع کی جائے؟

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، ایک بین الاقوامی ادارہ ہے، جس میں بیش بہا اور نادر مخطوطات کا وسیع ذخیرہ ہے، مرحوم مولوی خدابخش خاں کی خواہش اور کتب خانے کے اصل مقصد کے پیش نظر ہر دور میں لائبریری میں مخطوطات کے استعمال کی سہولت بہم کی جاتی رہی ہے، ۱۹۵۴ء میں مخطوطات کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں فراہم کئے جانے کا انتظام ہوا مگر اس کے نقصانات کی وجہ سے اس کو بند کرنا پڑا اور خطیر رقم صرف کر کے مائکروفلم مشین جاپان سے منگائی گئی، کمپیوٹر سنٹر قائم ہونے کے بعد توضیحی فہرستوں کو کمپیوٹر پر مرتب کیا گیا اور ویب سائٹ بھی بنا اور گھر بیٹھے لوگوں کو لائبریری کے مقاصد اور توضیحی فہرست سے واقفیت ہوگئی، لائبریری سافٹ ویر بھی خریدا گیا لیکن اس سسٹم میں صرف انگریزی کتابوں ہی کا احاطہ کیا جاسکتا ہے، اب مخطوطات کی اعداد گری (Degitizaton)

کا مرحلہ زیر غور ہے، جس کا مقصد لائبریری کے ذخائر تک عام لوگوں کی رسائی ہے تاکہ اصل مخطوطات کے جو امتداد زمانہ کی وجہ سے مرمت طلب ہو گئے ہیں، استعمال کو روکا اور ان کی جگہ ڈی جی ٹائز ڈ نسخہ استعمال کیا جائے، اس اسکیم کے ابتدائی مراحل اور نقشہ کار وغیرہ کو لائبریری کے سابق ڈائرکٹر جناب حبیب الرحمان چغانی تیار کر چکے تھے مگر اسے بروئے کار لانے کا سہرا موجودہ ڈائرکٹر ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری کے سر ہے، جن کی دعوت پر ۱۷/۱۸/ دسمبر کو لائبریری کے سمینار ہال میں ایک شاندار ورک شاپ ہوا۔

ورک شاپ کا افتتاح پٹنہ ہائی کورٹ کے جج آفتاب عالم صاحب نے کیا جو لائبریری بورڈ کے رکن اور اکیڈمک وایکزیکیٹیو کمیٹی کے صدر ہیں، صدارت پروفیسر نذر احسن سابق وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی نے کی، ڈائرکٹر انصاری صاحب نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا، شعبۂ ثقافت کے ڈائرکٹر آف لائبریری وجے لکھن پال جی نے کلیدی خطبہ دیا اور جناب حبیب الرحمان چغانی نے اپنے پرمغز اور پر از معلومات مقالے میں لائبریری کی مختصر تاریخ، عہد بہ عہد کی ترقیوں اور ورک شاپ کے موضوع کی اہمیت وضرورت اور اس کے مقاصد وفوائد پر روشنی ڈالی، اس کے بعد ورک شاپ کی نشستیں ۵ بجے تک اور دوسرے دن صبح ۹ بجے سے ۵ بجے شام تک مسلسل ہوتی رہیں جن کی صدارت وجے لکھن پال جی، مسز کلپنا داس گپتا سابق ڈائرکٹر سنٹرل سکریٹریٹ لائبریری، پروفیسر شمشاد حسین سابق وائس چانسلر نالندہ اوپن یونیورسٹی اور ڈاکٹر گوتم بوس سینیئر ٹکنیکل ڈائرکٹر نیشنل انفارمیکس سنٹر وغیرہ نے کی، مسٹر مجمدار ڈائرکٹر سنٹرل سکریٹریٹ لائبریری، کماری اوما مجمدار انچارج کمپیوٹر سیکشن نیشنل لائبریری کلکتہ، ڈاکٹر مظہر الاسلام انچارج شعبۂ مخطوطات نیشنل لائبریری کلکتہ، ڈاکٹر ابو سعد اصلاحی اسسٹنٹ لائبریرین رام پور رضا لائبریری اور مسٹر متھلیش کمار سنہا سکریٹری گورنر بہار، پرائیویٹ کمپنیوں اور پٹنہ کے کئی اصحاب علم ونظر نے بحث ومباحثہ میں حصہ لیا، یہ ناچیز اور بے خبر بھی ورک شاپ سے استفادہ کے لئے وہاں حاضر ہوا تھا، طویل بحث و گفتگو کے بعد طے پایا کہ ایک سال کے اندر مخطوطات کے ۵ لاکھ صفحے کے ڈی جی ٹائزیشن کرانے کے لئے حکومت کے پاس بھیجے جائیں، تاکہ اس کے لئے رقم حاصل کی جائے، ورک شاپ کے پہلے روز شب میں شام غزل کا پروگرام بھی ہوا، اس میں اجیت گنگولی اور ان کی اہلیہ نے اپنی دلکش آواز میں کلیم عاجز، اکبرالہ آبادی، قتیل شفائی اور امیر خسرو اور دوسرے شعرا کی غزلیں سنا کر شائقین کو محظوظ کیا۔



# مقالات

## قرآنِ عظیم کے سائنٹفک دلائل

از مولانا محمد شہاب الدین ندوی مرحوم☆

(۲)

### عالم نباتات میں ربوبیت کے جلوے

۵۔ نباتات کی دنیا تحیر خیزیوں سے بھری ہے، چنانچہ نباتات کے اتنے گونا گوں مظاہر اور ان کی ''سیرتوں'' کے اندر ایسے عجوبے سمودئے گئے ہیں جو انسانی عقل ودانش کے لئے ایک چیلنج بنے ہوئے ہیں، انسان ربوبیت کے ان مظاہر اور ان کی بوقلمونی کو دیکھ کر حیرت زدہ ہے کہ قدرتِ خداوندی کے یہ نقش ونگار کیسے اور کس طرح ظہور پذیر ہوگئے؟ مادہ پرستوں کے نزدیک یہ سب ''ارتقا'' کا نتیجہ ہے جو بغیر کسی خالق کے از خود عمل میں آرہا ہے، مگر ''ارتقائی'' نقطۂ نظر سے ان عجیب وغریب مظاہر کی معقول تشریح وتوجیہ نہیں ہوسکتی، بلکہ لامحالہ طور پر ایک زبردست اور خلّاق ہستی کے وجود کا اعتراف کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ لاکھوں قسم کے نباتات میں سے ہر پیڑ پودا ایک ''انوکھی شان'' لئے ہوئے ہے، جس میں ارتقا کا نام ونشان بھی دکھائی نہیں دیتا، بلکہ ہر پیڑ پودا اپنی جگہ پر قدرتِ خداوندی کا ایک ''معجزہ'' نظر آتا ہے، گویا کہ وہ اللہ کی نشانی یا اس کے وجود کی ایک ''آیت'' ہے، ظاہر ہے کہ ہر ایک پیڑ پودے کی ''فطرت'' بالکل جدا ہے، جو دوسرے سے میل نہیں کھاتی اور کوئی ایسی دو انواع جن میں باہم ظاہری طور پر کچھ مشابہت نظر آرہی ہو، وہ بھی بالکل جدا ہوتی ہیں، چنانچہ ہر ایک کا نیچر

☆ سابق جنرل سکریٹری، فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ، بنگلور۔ ۲۹

الگ اور ہر ایک کے طبعی خواص وتاثیرات الگ الگ ہوتے ہیں، اس اعتبار سے ہر ایک پیڑ پودا اپنی جگہ ایک نرالی شان لئے ہوئے ہے، جو ارتقا کا نتیجہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔

نظریۂ ارتقا پر تفصیلی بحث کا یہ موقع نہیں ہے، مگر اس مردود نظریہ کے ابطال کی ایک قوی دلیل یہ ہے کہ جو چیز بغیر کسی خالق اور اس کے منصوبے کے از خود وجود میں آجائے اس میں نفاست اور حسن کاری نمودار ہوجانا ممکن نہیں ہے، اس لحاظ سے دنیائے نباتات میں جو گلکاریاں، رعنائیاں اور دلفریبیاں پائی جاتی ہیں اور ان میں جو حسین وجمیل مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں وہ اپنی زبانِ حال سے چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں کہ انہیں بنانے اور ڈھالنے میں ایک ان دیکھی مگر انوکھی قدرت والی ہستی کا ہاتھ ہے، جو پردے کے پیچھے بیٹھ کر اپنے وجود کی خبر دے رہی ہے، اسی لئے فرمانِ باری ہے:۔

وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَآ أَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنْبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيجٍ -
(حج : ۵)

اے مخاطب تو زمین کو خشک دیکھتا ہے مگر جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ اچانک حرکت میں آکر پھول جاتی ہے اور ہر قسم کے خوش نما زوج (نر و مادہ پھول) اگا دیتی ہے(۱)۔

وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيجٍ تَبْصِرَةً وَّذِكْرَىٰ لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيبٍ -
(ق : ۷ - ۸)

ہم نے زمین کو (اس کی پوری گولائی میں) پھیلادیا ہے اور اس میں مضبوط پہاڑ ڈال دئے ہیں اور اس میں ہر قسم کے خوش نما زوج (نر و مادہ پھول) اگا دئے ہیں، (اللہ کی طرف) رجوع ہونے والے ہر بندے کے لئے بصیرت وتنبیہ کی غرض سے۔

نباتات میں جو نقاشی اور حسن کاری ہوتی ہے اس کی اصل وجہ ان کے رنگوں کا اختلاف وامتزاج ہے، جو خاص کر پھولوں میں نمودار ہوتا ہے، چنانچہ ربوبیت کے ان گل بوٹوں کو دیکھ کر طبیعت جھوم اٹھتی ہے اور ان کے البیلے پن کو دیکھ کر قدرت کی اس بے مثال کاری گری کی بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے، اسی بنا پر رنگوں کے اس اختلاف اور ان کی بوقلمونی کو ربوبیت کی دلیل قرار دیا گیا ہے:۔



وَمَا ذَرَأَ لَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَذَّكَّرُونَ -
(نحل : ۱۳)

اور اس نے تمہارے لئے زمین میں جو چیزیں پھیلا دی ہیں وہ رنگ برنگی ہیں، یقیناً ان مظاہر میں چونکنے والوں کے لئے ایک بڑی نشانی موجود ہے۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ ثَمَرَاتٍ مُّخْتَلِفًا أَلْوَانُهَا -
(فاطر: ۲۷)

اے مخاطب کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے بادل سے پانی برسایا تو ہم نے اس کے ذریعہ رنگ برنگے میوے اگا دئے۔

اس میں ربوبیت کا کمال یہ ہے کہ ایک ہی پانی، ایک ہی مٹی، ایک ہی ہوا اور ایک ہی سورج کی روشنی میں پھلنے پھولنے والے یہ لاکھوں قسم کے نباتات مختلف رنگ وروپ سے آراستہ کیوں کر ہیں؟ اس کی توجیہ دنیا کا کوئی بھی سائنس داں کرنے سے قاصر ہے، ظاہر ہے کہ بغیر کسی خالق یا کاریگر کے اعتراف کے ان جلوہ آرائیوں کی کوئی بھی معقول وجہ نہیں ہوسکتی، لہذا مظاہر فطرت کی یہ گلکاریاں اور ان کی رنگارنگیاں وجود باری کی ناقابل تردید دلیل ہیں، ربوبیت کے یہ وہ ''تخلیقی معجزات'' ہیں جن کا انکار ممکن نہیں ہے، غرض ان دلائلِ ربوبیت کے ملاحظے سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ اس پردۂ زنگاری کے ماوراء کوئی ایسی ہستی ضرور موجود ہے جو عجیب وغریب قدرت والی اور ہر چیز پر قادر ہے اور انسان کے لئے اس کی صناعیوں کو صحیح طور پر سمجھنا بھی مشکل ہے۔

### زمین کی دوبارہ شادابی دلیلِ قیامت

اس موقع پر باری تعالیٰ نے زمین کے خشک ہوجانے کے بعد بارش کے پانی سے اس کی دوبارہ سرسبزی وشادابی کو انسانوں کے لئے دوبارہ زندہ کئے جانے کی ایک دلیل کے طور پر بیان کیا ہے، چنانچہ خزاں کے موسم میں بیشتر نباتات خشک ہوکر ختم ہو جاتے ہیں اور درخت بھی پت جھڑ کی بنا پر خزاں زدہ ہوکر ''مردہ'' نظر آنے لگتے ہیں، اس طرح زمین گویا کہ موت سے دوچار دکھائی دیتی ہے، مگر جیسے ہی بارش ہوتی کہ ہر طرف سبزہ اگ جاتا ہے اور وہ ہری بھری دکھائی دیتی ہے، گویا کہ وہ پھر سے زندہ ہوکر جاگ اٹھی ہو، یہ ایک تمثیل ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسی طرح مرے ہوئے لوگوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے، لہذا اس میں عجوبے کی کوئی بات نہیں ہے، چنانچہ اس حقیقت پر دیگر مقامات میں اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے:۔

وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَابِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ۔

(نحل : ۶۵)

اللہ نے بادل سے پانی برسایا پھر اس کے ذریعہ زمین کو اس کے مردہ ہو چکنے کے بعد زندہ کر دیا، اس مظہر ربوبیت میں سننے والوں کے لئے یقیناً ایک بڑی نشانی موجود ہے۔

وَاللّٰهُ الَّذِيْ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَحْيَيْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ۔

(فاطر : ۹)

اللہ وہ ہے جس نے ہواؤں کو بھیجا جو بادل کو اٹھاتی ہیں پھر ہم نے اسے ایک مردہ خطے کی طرف ہانک دیا اور پھر اس کے ذریعہ زمین کو مردہ ہو چکنے کے بعد (دوبارہ) زندہ کر دیا، اسی طرح (انسانوں کو بھی دوبارہ) اٹھایا جائے گا۔

اس اعتبار سے نباتاتی مظاہر میں وجود باری اور اس کی ربوبیت کے علاوہ حیات ثانی کی حقانیت پر بھی دلائل موجود ہیں، چنانچہ ان میں سے بعض دلائل کی تفصیل کے لئے ہماری کتاب ''قرآن حکیم اور علم نباتات'' دیکھنی چاہئے۔

### عالم حیوانات میں ربوبیت کے جلوے

۶۔ حیوانات کی دنیا نباتات سے زیادہ عجیب اور محیر العقول ہے، سائنسی سروے کے مطابق اس وقت روئے زمین پر آٹھ لاکھ قسم کے حیوانات پائے جاتے ہیں، جن کی شکل وصورت، رنگ وروپ اور چال ڈھال مختلف اور ان کے طبائع جدا جدا ہیں، ایک دوسرے سے کوئی مناسبت ہی نہیں ہے، مگر ان کے یہ سارے اختلافات ارتقا کا نتیجہ ہرگز نہیں ہیں، کیونکہ نظریۂ ارتقا ان اختلافات کی کوئی بھی معقول توجیہ کرنے سے قاصر ہے، اسی بنا پر بہت سے سائنس داں نظریۂ ارتقا کی تردید کرتے ہوئے سائنسی اعتبار سے اسے ایک غیر معقول نظریہ قرار دیتے ہیں، جسے مادہ پرستوں نے محض مذہب کی ضد میں گھڑ لیا ہے (۲)، واقعہ یہ ہے کہ جو مظاہر ربوبیت باریٔ تعالیٰ کے وجود اور اس کی زبردست قدرت وخلاقیت پر دلالت کرنے والے ہیں انہیں مادہ پرستوں نے ''از خود ارتقا'' کا نام دے کر نوع انسانی کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے، تاکہ خدا کا ''نام ونشان'' بھی باقی نہ رہے معاذ اللہ، مگر یہ علمی دنیا کا عجیب وغریب واقعہ ہے کہ وہ جیسے جیسے اپنی اس مہم میں آگے بڑھ رہے ہیں، خود انہی کی تحقیقات کی بدولت نہ صرف خدا



کا وجود ثابت ہو رہا ہے بلکہ اس سلسلے میں نئے نئے دلائل بھی سامنے آرہے ہیں، گویا کہ مادہ پرستوں کی تحقیقات خود ان ہی کے خلاف حجت ہے، ظاہر ہے کہ یہ خدائے خلاق کی حیرت انگیز حکمت ومنصوبہ بندی ہے، تاکہ الحاد و مادیت کی تردید مؤثر طور پر وقوع میں آسکے، کیونکہ مادہ پرست اپنی ہی تحقیقات کا انکار نہیں کر سکتے، اسی بنا پر فرمایا گیا ہے کہ دنیائے حیوانات میں غور وفکر کرنے والوں کے لئے دلائل ربوبیت موجود ہیں، جو ہر قسم کے شرک اور مادہ پرستی کا رد وابطال کر کے خدائے جبار وقہار کے وجود اور اس کی وحدانیت کا اثبات کرنے والے ہیں:۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ۔

(شوریٰ : ۲۹)

اور اس کے وجود کی نشانیوں میں سے ہے زمین اور آسمانوں کا پیدا کرنا اور ان دونوں میں (طرح طرح کے) جانداروں کا پھیلا دینا۔

وَفِيْ خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ۔

(جاثیہ : ۴)

تمہاری خلقت میں اور ان جانداروں میں جن کو اللہ نے (روئے زمین پر) پھیلا دیا ہے، یقین کرنے والوں کے لئے وجود باری کی (بہت سی) نشانیاں موجود ہیں۔

چنانچہ ان دلائل ربوبیت کی تحقیق وتفتیش کے لئے حیاتیاتی علوم (۳) کو کھنگالنا ضروری ہے، جو نوع انسانی کیلئے مؤثر طور پر حجت بن سکتے ہیں، اسی طرح اقوام عالم کی مختلف زبانوں اور رنگتوں میں بھی دلائل ربوبیت موجود ہیں، جیسا کہ ارشاد باری ہے:۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ۔

(روم : ۲۲)

اور اس کے وجود کی نشانیوں میں سے ہے زمین اور آسمانوں کا پیدا کرنا اور تمہاری زبانوں اور رنگتوں میں اختلاف رکھ دینا، یقیناً ان مظاہر میں اہل علم کے لئے وجود باری کی نشانیاں موجود ہیں۔

### ہواؤں کے نظام میں آیات ربوبیت

۷۔ ہواؤں کا نظام بھی حد درجہ حیرت انگیز ہے، چنانچہ کبھی پروا (مشرقی) ہوائیں چلتی ہیں تو کبھی پچھوا (مغربی) ہوائیں، کبھی ادھر سے چلتی ہیں تو کبھی ادھر سے اور ان کا اجراء بالکل منظم ہوتا ہے، چنانچہ سال کے بارہ مہینوں میں وہ

متعین وقت کے مطابق ہی چلتی ہیں اور اس میں کبھی تفاوت نہیں ہوتا، چنانچہ پُروا ہوا اپنے وقت پر آئے گی اور پچھوا ہوا اپنے وقت پر، نیز اسی طرح یہ ہوائیں بادلوں کو ہنکانے میں نہایت درجہ اہم رول ادا کرتی ہیں، ورنہ دور دراز علاقوں میں لوگ پانی کے لئے ترس ترس کر اور تڑپ تڑپ کر مر جاتے، لہٰذا یہ ہوائیں، یہ بادل اور بارش کا یہ پانی مخلوقِ خدا کے لئے رحمت کا باعث ہیں، جن کا نظام خدائے رحمان نے اپنی پروردگاری کے اظہار کے طور پر بنایا ہے، نیز دورِ قدیم میں پانی میں چلنے والی کشتیاں اور جہاز بھی انہیں ہواؤں کے رحم و کرم پر منحصر ہوتے تھے، اس لحاظ سے ہواؤں کا نظام اور ان سے جڑے ہوئے ان تمام مظاہر میں وجودِ باری کی نشانیاں (آیاتِ الٰہی) بدرجۂ اتم موجود ہیں جن کا انکار کوئی اندھا بہرا شخص ہی کر سکتا ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ يُّرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّلِيُذِيْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَلِتَجْرِيَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۔

(روم : ۴۶)

اس کے وجود کی نشانیوں میں سے ہے یہ بات کہ وہ ہواؤں کو (بارش کی) خوش خبری لانے والی بنا کر بھیجتا ہے اور (اس لحاظ سے بھی کہ) وہ تمہیں اپنی رحمت کا مزہ چکھائے اور اس لئے بھی کہ کشتیاں اس کے حکم سے (سمندر میں) چل سکیں، نیز (اس کے نتیجے میں) تم اس کا فضل تلاش کر سکو اور شکر گزار بن سکو۔

اس سلسلے کی یہ ایک بہت ہی جامع آیت ہے جس میں ان تمام مظاہرِ ربوبیت کا تذکرہ اختصار کے ساتھ کر دیا گیا ہے۔

**بادلوں کے نظام میں نشاناتِ باری**

۸۔ بادلوں کا نظام بھی معجزاتِ ربوبیت میں شامل ہے، کیونکہ پانی کے ٹرانسپورٹ کا یہ ایک حیران کن نظام ہے، جو بجائے زمین پر سفر کرنے کے ہواؤں کے کندھوں پر سوار ہو کر آتا ہے، اس لحاظ سے ہوا اور بادل میں بہت گہرا تعلق ہے اور جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا یہ پانی سورج کی گرمی کی وجہ سے سمندروں سے اوپر اٹھ کر بادل کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور پھر اوپر ہی اوپر سے سفر کرتا ہوا دور دراز کے علاقوں کو سیراب کرتا ہے، ظاہر ہے کہ کروڑوں اربوں ٹن وزنی پانی کا اوپر اٹھ کر ایک علاقے سے دوسرے علاقے تک پہنچنا ایک عجیب و غریب مظہرِ ربوبیت ہے اور ایسا حیران کن نظام رب العالمین ہی کی قدرت و خلاقیت کی



بدولت ہے، اسی بنا پر اس عجوبۂ روزگار چیز کو دلیلِ ربوبیت قرار دیا گیا ہے۔

هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ۔

(رعد : ۱۲)

وہی ہے (تمہارا رب) جو تم کو خوف اور امید کے طور پر بجلی (کا کڑکا) دکھاتا ہے اور وزنی بادل پیدا کرتا ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَاۗءِ كَيْفَ يَشَاۗءُ وَيَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۔

(روم : ۴۸)

اللہ وہ ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے تو وہ بادل کو حرکت میں لاتی ہیں، پھر وہ اسے آسمانی (فضاؤں) میں جس طرح چاہے پھیلا دیتا ہے اور پھر وہ اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے، اس کے نتیجے میں تو دیکھ سکتا ہے کہ بارش (کا پانی) اس کے اندر سے نکل رہا ہے، بہر حال وہ اس پانی کو اپنے بندوں میں سے جن کو چاہتا ہے ان تک پہنچاتا ہے تو وہ خوش ہو جاتے ہیں۔

اس مظہرِ ربوبیت کا ایک اور حیران کن پہلو یہ ہے کہ یہ بادل ہمیشہ ایک خاص بلندی پر پہنچ کر معلق ہو جاتا ہے مگر وہ کرۂ فضائی (۴) میں اور زیادہ اوپر پہنچ کر غائب ہونے نہیں پاتا، کیونکہ حکیم مطلق نے اس کے لئے یہی طبیعی ضابطہ (تقدیرِ الٰہی) مقرر کیا ہے، ورنہ صاف ظاہر ہے کہ انسان بڑی مشکلوں میں پڑ جاتا۔

**باریٔ تعالیٰ کی منصوبہ بندی**

بہر حال یہ آٹھ قسم کے دلائل ہیں جو زمین سے لے کر آسمان تک تمام مظاہرِ ربوبیت کے نظاموں میں سمو دئے گئے ہیں اور اصولی اعتبار سے کوئی بھی مظہرِ ربوبیت اس دائرے سے باہر نہیں ہے، اس لحاظ سے یہ عظیم ترین آیت کریمہ بجائے خود ایک معجزہ ہے جو سارے جہاں کا احاطہ کئے ہوئے ہے، ظاہر ہے کہ اتنا وسیع اور جامع کلیہ وہی وضع کر سکتا ہے جو ان تمام مظاہر کا خالق ہو، اس لحاظ سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ باریٔ تعالیٰ نہ صرف اس پوری کائنات کا خالق و کارساز ہے بلکہ وہ حیرت انگیز طور پر ان کے تمام نظاموں اور ان کی اندرونی مشنری سے بھی بخوبی واقف ہے، اس اعتبار سے اس کی ربوبیت کے دو بازو، قدرت و علامیت کا بھی سائنٹفک ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ جس ہستی نے ان مظاہر کی تخلیق کی ہے وہ ان کے ایک ایک کل پرزے کا صحیح علم

بھی رکھتی ہے، اس مظاہرِ ربوبیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے عصر حاضر میں باریٔ تعالیٰ کی ربوبیت کے جو جلوے اور اس کے جو دلائل و بینات سامنے آرہے ہیں وہ خدائی منصوبے کے عین مطابق ہیں، لہذا اس کائنات کا کوئی ایک تنکا بھی اس کی منصوبہ بندی سے باہر نہیں ہے۔

**حسی معجزات اور دلائل ربوبیت** حاصل یہ کہ یہ مادی کائنات عقلی اور سائنٹفک اعتبار سے عجائب وغرائب یا خلاقِ عالم کے ''تخلیقی معجزات'' سے بھری ہوئی ہے، جن کی صحیح حقیقت و ماہیت تک سمجھنے سے انسان عاجز ہے، یہ تمام مادی مظاہر بنیادی طور پر عناصر و جواہر اور سالمات کا مجموعہ ہونے کے باوجود عالمِ انسانی کو ورطۂ حیرت میں مبتلا کئے ہوئے ہیں اور ان کی نیرنگیوں سے سر چکرانے لگتا ہے، خود انسان بھی ان ہی عناصر و جواہر اور سالمات کا مجموعہ ہے جو اپنی جگہ پر عالم اصغر کہلاتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ سب عناصر و جواہر کا کھیل ہے جو عالم انسانی کے لئے جادو کی نگری یا طلسم ہوش رُبا سے کسی بھی طرح کم نہیں ہے۔

نوع انسانی کے اذعان کے لئے دور قدیم میں انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والسلام کو حسی معجزات دے کر بھیجا جاتا تھا، مگر عصر حاضر میں اس کی ذہن سازی کے لئے اسے دلائلِ ربوبیت دکھائے جارہے ہیں اور ان دونوں (حسی معجزات اور دلائل ربوبیت) ہی کو قرآن مجید میں ''آیات'' سے تعبیر کیا گیا ہے، کیونکہ ان دونوں کا بنیادی مقصد ایک ہی ہے کہ ان کو دیکھ کر لوگ باریٔ تعالیٰ کی ربوبیت پر ایمان لائیں اور اپنی عاقبت درست کرلیں، ظاہر ہے کہ یہ بھی قرآن عظیم کی بے مثال ''ہدایت'' ہی کا ایک نیا جلوہ ہے جو اس کے بنیادی وصف کے عین مطابق ہے، اسی وجہ سے باریٔ تعالیٰ نے پہلے ہی یہ اعلان کردیا ہے کہ وہ اپنے دلائلِ ربوبیت عالم انسانی کو ضرور دکھادے گا، جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ۔

ہم عنقریب ان (منکرین) کو اپنی نشانیاں دکھاتے رہیں گے، ان کے چاروں طرف اور خود ان کی ہستیوں (ان کے جسمانی، حیاتیاتی اور نفسیاتی نظاموں) میں بھی، تاآنکہ ان پر اچھی طرح ظاہر ہوجائے کہ یہ کلام (اپنے حیرت انگیز حقائق کی بنا پر) برحق ہے تو کیا یہ بات



بات (ان کی تسلی کے لئے) کافی نہیں ہے کہ تمہارا رب (اس کائنات کی) ہر چیز سے بخوبی واقف ہے؟

(حم سجدہ : ۵۳)

**اللہ کا ایک وعدہ** اس آیتِ کریمہ میں ''آفاق'' سے مراد ''اقطار السماوات والارض'' ہیں (۵)، یعنی زمین اور آسمان کے کنارے، ایک دوسری تفسیر کے مطابق اس سے مراد ''نواحی الارض'' یا ''نواحی السماء'' ہیں (۶)، یعنی زمین یا آسمان کے گوشے، اس سے مقصود چاروں طرف پھیلی ہوئی چیزیں، جن میں اجرامِ سماوی، نباتات، حیوانات اور جمادات سب کے سب شامل ہوسکتے ہیں، اس لحاظ سے یہ بھی ایک جامع اور وسیع کلیہ ہے جو تمام مظاہر ربوبیت کا احاطہ کئے ہوئے ہے، غرض یہ آیت کریمہ سورۂ بقرہ کی مذکورۂ بالا آیت (۱۸۵) کی بھی تفسیر کرتے ہوئے اس حقیقت کو بے نقاب کررہی ہے کہ باریٔ تعالیٰ مذکورۂ بالا آٹھ قسم کے مظاہر میں موجود اپنے دلائلِ ربوبیت منکرین و معاندین کو دکھاتے رہے گا، جیسا کہ ایک دوسرے موقع پر مرقوم ہے:۔

خُلِقَ الْإِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ سَأُرِيكُمْ آيَاتِي فَلَا تَسْتَعْجِلُونِ۔

انسان کی سرشت میں جلد بازی رکھ دی گئی ہے، میں عنقریب اپنی نشانیاں (دلائلِ ربوبیت) تمہیں دکھاکے رہوں گا، لہذا تم جلدی مت کرو۔

(انبیاء : ۳۷)

چنانچہ باریٔ تعالیٰ کا یہ بھی وعدہ ہے کہ وہ اپنی آیات و نشاناتِ ربوبیت نوعِ انسانی کو پے در پے دکھاتا رہے گا، جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے:۔

وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ فَأَيَّ آيَاتِ اللّٰهِ تُنْكِرُونَ۔

وہ تم کو اپنی نشانیاں دکھادے گا، پھر تم اللہ کی کن کن نشانیوں کا انکار کرتے رہوگے؟

(مومن : ۸۱)

**دلائلِ ربوبیت اور اہلِ اسلام کا فریضہ** اب سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ کب اور کیسے پورا ہوگا؟ تو اس کا جواب صاف ہے کہ اس کی ذمہ داری حاملینِ قرآن ہی پر عائد ہوتی ہے کہ وہ تمام ''تکوینی'' یا مادی علوم کا مطالعہ کرکے ان علوم میں موجود مظاہرِ عالم کی ''شہادتوں'' کو ڈھونڈ نکالیں، جن کے ذریعہ منکرین و معاندین پر خدا کی حجت پوری ہوسکتی ہے، آج جدید سائنس صحیفۂ فطرت کے ان تمام مظاہر کا مطالعہ نہایت درجہ باریک بینی کے ساتھ کررہی ہے، لہذا آج اہلِ اسلام پر یہ شرعی فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ سائنسی علوم و معارف کے اس سمندر کو کھنگال کر ان میں

مذکور دلائل ربوبیت کی نشاندہی کریں اور ان میں مادیت کے جو عناصر سرایت کر گئے ہیں انہیں نکال باہر کر کے نوع انسانی کی صحیح رہنمائی کریں، تا کہ اسے الحاد و لادینیت کے عذاب سے چھٹکارا مل سکے اور یہ کام آج صرف علم برداران اسلام ہی کر سکتے ہیں جو ایک حیرت انگیز صحیفے کے حامل ہیں اور وہ اس سلسلے میں بھی ان کی رہنمائی کر سکتا ہے، کیونکہ نوعِ انسانی کو سرچشمۂ ہدایت کی طرف لانے کا فریضہ شرعاً انہیں پر عائد ہوتا ہے، جیسا کہ ارشادِ باری ہے:۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ۔ ( بقرہ : ۱۴۳ )

اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک معتدل امت بنایا ہے تا کہ تم لوگوں پر گواہ بن سکو۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔

( آل عمران : ۱۱۰ )

تم بہترین امت ( بنا کر بھیجے گئے ) ہو جو پوری نوع انسانی کے لئے مبعوث کی گئی ہے اور ( تمہارا فریضہ یہ ہے کہ ) تم اسے معروف ( جانی پہچانی باتوں ) کا حکم کرتے اور اسے منکر ( غیر جانی پہچانی باتوں ) سے روکتے ہو۔

چنانچہ معروف اور منکر کے ان دو پیمانوں میں علوم و فنون میں سرایت کردہ ''خیر'' اور ''شر'' بھی داخل ہو سکتا ہے، جو عقلی و علمی اعتبار سے نوع انسانی کے لئے حجت بن سکتا ہو، لہذا جدید سائنسی علوم کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے کر کے ان میں موجود خیر اور شر کو الگ الگ کرنا اور نوع انسانی کی ذہنی و صلاحی کرنا اہل اسلام ہی کا ذمہ ہے اور اس مقصد کے لئے اہل اسلام کی ایک ایسی خصوصی جماعت کی تشکیل ضروری ہے جو پختہ کار علماء اور مختلف علوم کے ماہرین پر مشتمل ہو، کیونکہ کوئی ایک یا دو فرد اس کارِ عظیم کو علی وجہ البصیرت انجام نہیں دے سکتے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ ( آل عمران : ۱۰۴ )

اور چاہئے کہ تم میں ایک خصوصی جماعت ہو جو ( لوگوں کو ) خیر کی طرف بلائے اور ( انہیں ) معروف کا حکم کرے اور منکر سے روکے۔

یہ جماعت اہلِ اسلام کے اندر مطلوب ہے، جیسا کہ ''وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ'' کے الفاظ دلالت کر رہے ہیں، یعنی ایک خصوصی جماعت جو خاص کر نوع انسانی کی اصلاح کرنے اور اس کے



نظریاتی اختلافات کو دور کر کے اسے راہ ہدایت دکھانے والی ہو، اسی لئے ارشادِ باری ہے:۔

الٓرٰ، كِتَابٌ اَنْزَلْنَاهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ۔

( ابراہیم : ۱ )

الف لام را، یہ ایک کتاب ہے جو ہم نے آپ پر نازل کی ہے، تا کہ آپ نوع انسانی کو ( شرک و کفر کی ) تاریکیوں سے نکال کر نور ( ہدایت ) کی طرف لاسکیں، ان کے رب کے حکم سے خدائے غالب کے راستے کی طرف جو قابلِ حمد ہے۔

## اسلام کی نشأۃ ثانیہ کیوں اور کیسے؟

حاصل یہ کہ صحیفۂ فطرت میں مذکور دلائلِ ربوبیت کی تحقیق و تدوین کر کے عالم انسانی کی صحیح ہدایت و رہنمائی کرنا اہل اسلام ہی کا فریضہ ہے جس سے وہ منہ نہیں موڑ سکتے، ورنہ وہ شرعی اعتبار سے مجرم قرار پائیں گے، ان سے بڑھ کر صاف و صریح احکام اور کیا ہو سکتے ہیں، اب اہل اسلام سوچیں کہ وہ اپنے اس شرعی فریضے کو کہاں تک ادا کر رہے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ کام حاملین قرآن ہی کے کرنے کا ہے اور اس کے لئے آسمان سے فرشتے نازل نہیں ہوں گے۔

اس کام سے دوہرے فوائد کی توقع ہے: اول یہ کہ اس سے عالمِ انسانی کے سامنے ہدایت و ضلالت کا راستہ واضح ہو جائے گا اور دوم یہ کہ علمی اعتبار سے اسلام کی برتری ثابت ہو جائے گی، جس کے نتیجے میں اسلام اور اہلِ اسلام کی نشأۃ ثانیہ بھی عمل میں آئے گی، کیونکہ یہ عمل احیائے علم اور احیائے دین کا باعث بنے گا، چونکہ آج دنیا اسلام اور اسلامی نظام حیات کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہوئے اسے ایک ''غیر معقول'' دین قرار دینے کا پروپگنڈہ کر رہی ہے، لہذا اسے علمی میدان میں کھینچتے ہوئے آج ہمیں یہ ثابت کرنا ہے کہ اسلام میں غیر معقول قسم کی کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کی تمام تعلیمات صحیح عقل اور صحیح منطق کی میزان میں کھری اترتی ہیں اور یہ عمل جب تک پورا نہ ہوگا اسلام اور اہل اسلام کی نشأۃ ثانیہ محض ایک خواب ہی بنی رہے گی جو کبھی پورا نہ ہوگا، لہذا اہلِ اسلام کو اس کارِ عظیم کے لئے پوری طرح تیار ہو جانا چاہئے۔

## موجودہ دور کا سب سے بڑا اجہاد

واضح رہے کہ اسلام کی نشأۃ ثانیہ احیائے علم کے تابع ہے اور احیائے علم کے لئے علمی و استدلالی میدان میں دینِ الٰہی کی برتری ثابت کرنا ضروری ہے،

ورنہ ظاہر ہے کہ علم و استدلال کے بغیر علمی دنیا کو قائل کرانا ممکن نہیں ہے، لہذا موجودہ مادہ پرستانہ فلسفوں اور مادہ پرستانہ ذہنیت کا مقابلہ دلیل و استدلال ہی کے ذریعہ ممکن ہوسکتا ہے، جب علمی حلقے یا دانشوران قائل ہوجائیں تو پھر عوام ان کی پیروی کرنے پر مجبور ہوجائیں گے، اس لحاظ سے آج اہل اسلام کے سامنے دینِ الٰہی کو غالب کرنے کا بس ایک ہی راستہ رہ گیا ہے کہ وہ قرآنِ عظیم کے علمی یا سائنٹفک دلائل کا استنباط کرکے احیائے دین کا فریضہ انجام دیں اور اس کارِ عظیم کے لئے پوری طرح کمربستہ ہوجائیں، یہی موجودہ دور کا سب سے بڑا جہاد ہے، جو قرآنِ عظیم کے ذریعہ یعنی اس کے حقائق و معارف یا اس کے علمی دلائل کے ذریعہ مطلوب ہے، چنانچہ خود قرآنِ عظیم نے اسے ایک بہت بڑا جہاد قرار دیا ہے:۔

وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا. (فرقان: ۵۲) اور تم قرآن کے ذریعہ ان کے ساتھ ایک بڑا جہاد کرو۔

یہ وہ علمی جہاد ہے جو ہر دور میں اس کے تقاضوں کے تحت مطلوب ہے، کیونکہ کتاب اللہ میں ہر دور کے ذہنی امراض کے لئے دوائے شافی اور شفائے کلی موجود ہے، خواہ زمانہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرجائے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ۔ (یونس: ۵۷)

اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے (سامانِ) موعظت اور دلوں کے امراض کے لئے (سامانِ) شفاء آچکا ہے اور (اس بنا پر یہ قرآن) اہل ایمان کے لئے ہدایت و رحمت کا باعث ہے۔

یہ قرآن عظیم کے صاف و صریح احکام ہیں، جن پر بے چون و چرا عمل کرنا اہلِ اسلام کے لئے ضروری ہے، کیونکہ اسی میں ان کی حیات اور نجات ہے، آج مسلمانوں پر جو بھی نحوست طاری ہے وہ قرآن حکیم کو ترک کردینے کی وجہ سے ہے، لہذا اب انہیں پوری طرح بیدار ہوکر دین الٰہی کی نشاۃ ثانیہ اور خلافتِ ارض کے حصول کے لئے جدوجہد کرنے اور اس مقصد کے لئے تن من دھن کی بازی لگادینے کی ضرورت ہے، ورنہ اسلام کی صبح نو کا آغاز نہیں ہوسکتا، خدا کرے کہ یہ چند سطریں اہلِ اسلام پر اثر کرجائیں اور وہ کچھ کرنے کے لئے آمادۂ عمل ہوجائیں، آمین۔

واضح رہے اوپر دلائلِ ربوبیت کی اجمالی طور پر صرف نوعیت بیان کی گئی ہے نہ کہ ان کی



تفصیل، کیونکہ ان کی تفصیل کے لئے علوم و معارف کے سمندروں کو کھنگالنا ضروری ہے، مگر یہ کام کوئی اکا دکا آدمی نہیں کرسکتا، جب تک اسے تفصیل کے ساتھ اور علی وجہ البصیرت نہ کیا جائے نوعِ انسانی پر اتمام حجت نہیں ہوسکتی، لہذا اس کے لئے ایک ٹیم ورک کی ضرورت ہے جو مختلف علوم کے ماہرین پر مشتمل ہو۔

## خدائی دلائل کو چھپانے والوں کا انجام

آج اگر اہلِ اسلام نے اپنا یہ شرعی فریضہ ادا نہ کیا اور قرآنی دلائل و براہین کو واضح کرکے نوعِ انسانی کے لئے ہدایت و رہنمائی کا سامان فراہم نہ کیا تو پھر وہ فرمانِ الٰہی کی رو سے "کتمانِ حق" کے مرتکب قرار پائیں گے اور ان پر اللہ اور سارے جہاں کی لعنت ہوگی، جیسا کہ ارشاد باری ہے:۔

إِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ أُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ إِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَأَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا فَأُولٰٓئِكَ أَتُوْبُ عَلَيْهِمْ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۔ (بقرہ: ۱۵۹-۱۶۰)

جو لوگ ہمارے نازل کردہ کھلے دلائل اور ہدایت کو چھپاتے ہیں، جب کہ ہم نے اسے نوعِ انسانی کے لئے کتاب میں واضح طور پر بیان کردیا ہے، تو ایسے لوگوں پر اللہ بھی لعنت کرتا اور دیگر لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں، ہاں البتہ جو لوگ تائب ہوئے اور اصلاح کی اور (ہماری آیات کو) واضح کیا تو میں ان لوگوں کی توبہ قبول کرتا ہوں، کیونکہ میں توبہ بہت زیادہ قبول کرنے والا اور رحم دل ہوں۔

لہذا اب تک جو کچھ کوتاہیاں اس سلسلے میں دانستہ یا نادانستہ طور پر ہوئیں وہ قابل معافی ہوسکتی ہیں، بشرطیکہ مسلمان اب تائب ہوکر اپنے اس شرعی فریضے کو ادا کرنے کے لئے پوری طرح آمادہ ہوجائیں، ورنہ اگر وہ خدا کی نافرمانی ہی کی روش اپناتے ہوئے دنیا داری ہی میں لگے رہے تو ان کی حالت ایسی ہوجائے گی گویا کہ وہ قرآن کو چند سکوں کے عوض بیچ کر کھا رہے ہیں، چنانچہ ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا فتویٰ یہ ہے:۔

إِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا

جو لوگ اللہ کی اتاری ہوئی کتاب کے ایک حصے کو (لوگوں سے) چھپاتے اور اس کے بدلے میں تھوڑا

اُولٰٓئِکَ مَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِھِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا یُکَلِّمُھُمُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَلَا یُزَکِّیْھِمْ وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ۔ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَۃَ بِالْھُدٰی وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَۃِ فَمَآ اَصْبَرَھُمْ عَلَی النَّارِ ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ نَزَّلَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِی الْکِتٰبِ لَفِیْ شِقَاقٍ بَعِیْدٍ۔

(بقرہ: ۱۷۴ ـ ۱۷۶)

سا مول خریدتے ہیں تو ایسے لوگ اپنے پیٹوں میں جہنم کی آگ ہی بھرتے ہیں تو ایسے لوگوں سے اللہ قیامت [illegible] بات تک نہیں کرے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا۔ [illegible] ان کے لئے ایک دردناک عذاب ہوگا، یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی اور مغفرت کے بدلے عذاب خریدا ہے، تو یہ لوگ دوزخ کی آگ پر کس قدر ڈھیٹ ہیں؟ یہ بات اس لئے ہے کہ اللہ نے (اپنی) کتاب کو پوری حقانیت کے ساتھ اتارا ہے، لہذا جن لوگوں نے اس کتاب (کی حقانیت) میں اختلاف کیا تو وہ (اس کی) مخالفت میں دور نکل گئے ہیں۔

**نجات کا راستہ** یہ سخت وعید آج اہل اسلام پر پوری طرح صادق آرہی ہے اور اس معاملے میں عوام سے زیادہ خواص قابل مواخذہ ہیں، لہذا یہ آج پوری امت کے لئے ایک لمحہ فکریہ ہے اور باری تعالیٰ کی طرف سے ایک بہت بڑا انتباہ کہ اگر انہوں نے ان وعیدوں کے باوجود بھی اپنی صفوں کو درست نہ کیا اور عالم انسانی کی ہدایت و رہنمائی کے لئے کمربستہ نہ ہوئے تو عند اللہ وہی اصل مجرم قرار پائیں گے اور ان کی مغفرت کسی بھی طرح نہ ہو سکے گی، ( **فَمَآ اَصْبَرَھُمْ عَلَی النَّارِ** : یہ لوگ دوزخ کی آگ پر کس قدر ڈھیٹ ہیں)۔

تو کیا امت مسلمہ کو سنبھلنے اور کچھ کر دکھانے کا وقت ابھی نہیں آیا؟ آخر اب اسے مزید کس چیز کا انتظار ہے؟۔

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا یَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَیْھِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُھُمْ

کیا ایمان والوں کے لئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر اور جو (دین) حق نازل ہوا ہے اس کے سامنے جھک جائیں؟ اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو اس سے پہلے (آسمانی) کتاب دی گئی



وَکَثِیْرٌ مِّنْھُمْ فٰسِقُوْنَ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا قَدْ بَیَّنَّا لَکُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ۔

(حدید: ۱۶ ـ ۱۷)

تھی مگر جب ان پر مدت لمبی ہوگئی تو ان کے دل سخت ہوگئے اور ان میں سے اکثر نافرمان، جان لو کہ اللہ زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد (پھر سے) زندہ کرتا ہے، ہم نے اپنے دلائل وضاحت کے ساتھ بیان کردئے ہیں تاکہ تم سمجھ سے کام لے سکو۔

آج عالم اسلام پر چاروں طرف سے جو یلغار ہو رہی ہے اور اسلام کو ایک ''غیر معقول'' دین قرار دے کر مسلمانوں پر جو عرصہ حیات تنگ کیا جا رہا ہے اس کا صحیح جواب اب علمی واستدلالی میدان ہی میں ہونا چاہئے، اب مسلمانوں کے سامنے اپنی نجات [illegible] دونوں کا یہی ایک واحد راستہ رہ گیا ہے، کیونکہ آج وہ ''شمشیر و سنان'' کے میدان میں بہت پیچھے ہو گئے ہیں، لہذا اب ''دلیل و استدلال'' سے مفر نہیں ہے، لیکن اگر وہ اس میدان میں بھی فیل ہو گئے تو ان کا مکمل زوال و ادبار یقینی ہے، ذلت و رسوائی سے انہیں کوئی نہیں روک سکتا، بلکہ اللہ تعالیٰ بھی ایسے نافرمانوں کی کوئی مدد نہیں کرتا، کیونکہ خلافت ارض کے تقاضوں سے منہ موڑنے کا انجام سوائے قومی وملی تباہی کے اور کچھ نہیں ہے، جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:۔

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ ثُمَّ لَا یَکُوْنُوْٓا اَمْثَالَکُمْ۔

(محمد: ۳۸)

اگر تم (دین الٰہی کے تقاضوں سے) منہ پھیر لوگے تو اللہ تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو لے آئے گا، پھر وہ تم جیسے (نافرمان) نہ ہوں گے۔

## مراجع وحواشی

(۱) اس مظہر ربوبیت کی تفصیل کے لئے ہماری تصنیفات اور خاص کر ''قرآن کا نظریہ علم: سائنسی اکتشافات کی روشنی میں'' دیکھنی چاہئے۔
(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے راقم کی کتاب ''تخلیق آدم اور نظریہ ارتقا''۔
(۳) Biological Science
(۴) Atmosphere
(۵) تفسیر جلالین، ص ۶۲۷، مطبوعہ مصر (۶) تفسیر کبیر: ۲۷/۱۴۰، مطبوعہ دار الفکر بیروت۔

☆☆☆☆☆

# الفاروق کے فقہی مباحث ☆

از ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی ☆☆

الفاروق علامہ شبلی نعمانی کی بڑی اہم تصنیف ہے جس پر خود ان کو بھی فخر تھا، یہ اس دور کی علمی فتوحات کا ایک گراں قدر حصہ ہے جب وہ عربی و فارسی پروفیسر کی حیثیت سے ایم، اے، او، کالج علی گڑھ سے منسلک تھے (۱)، تاریخ اسلام سے ان کو دلچسپی ۱۸۸۲ء میں علی گڑھ آنے سے پہلے ہی ہوگئی تھی، لیکن ایم، اے، او، کالج میں اس موضوع پر انہیں جو مفید کتابیں ملیں اور مطالعہ و تحقیق کے جو بہترین مواقع فراہم ہوئے ان سے ان کا تاریخی ذوق مزید نکھر گیا اور تحقیق و تصنیف کے نئے انداز اور تاریخ نگاری کے نئے اسلوب سے بھی انہیں آگہی ہوئی (۲)۔

"الفاروق" بنیادی طور پر تاریخ کی کتاب ہے جس کا احساس اس کے مطالعہ سے قبل ہی آدمی کو ہوجاتا ہے اور وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اس میں عہد فاروقی کی سیاسی و انتظامی تاریخ زیر بحث آئی ہوگی لیکن اس دور کی مذہبی، علمی و تمدنی تاریخ سے متعلق جو قیمتی معلومات اس کتاب میں فراہم کی گئی ہیں ان سے بلاشبہ علامہ شبلی کے تصور تاریخ کی عظمت و وسعت واضح ہوتی ہے، یہ مباحث خاص طور سے کتاب کے دوسرے حصہ میں ملتے ہیں جنہیں خود صاحب کتاب نے "سعی و محنت کا تماشا گاہ" قرار دیا ہے (۳)، اس کتاب کی تالیف سے سرسید کو کچھ اختلاف تھا لیکن جہاں تک علامہ شبلی کی علمی و تحقیقی صلاحیت اور "الفاروق" کی قدر و قیمت کا تعلق ہے وہ ان کے پوری طرح معترف تھے (۳ الف)۔

یہ بات عام طور پر معروف ہے کہ قرآن، حدیث و سیرت کے ساتھ فقہ سے بھی علامہ شبلی کو کافی رغبت رہی ہے، اس موضوع پر متعدد مضامین اور بعض کتب کے علاوہ اپنی مختلف تصانیف میں

☆ یہ مقالہ ادارہ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے زیر اہتمام الفاروق پر منعقدہ سمینار ۱۸ و ۱۹ نومبر ۲۰۰۰ء کو پیش کیا گیا تھا۔

☆☆ ریڈر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔



انہوں نے فقہی مسائل سے تعرض کیا ہے، پیش نظر کتاب بھی اس پہلو سے مفید و قیمتی مواد سے بھری ہوئی ہے جس سے یقینی طور پر علم فقہ میں علامہ شبلی کی دلچسپی کا واضح ثبوت ملتا ہے، اس کتاب کے فقہی مباحث کو سہولیات کے لئے پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:۔

۱۔ علم فقہ میں حضرت عمرؓ کی دلچسپی و مہارت اور اس کی اشاعت کا اہتمام۔

۲۔ خلیفہ دوم اور اصول فقہ کے مسائل۔

۳۔ فقہی مسائل پر اظہار رائے اور افتاء کے اصول و ضوابط۔

۴۔ فقہی مسائل پر خلیفہ کے فتاوی و اجتہادات۔

۵۔ ذمیوں کے مسائل اور ان سے متعلق خلیفہ دوم کی قولی و عملی تشریحات۔

علامہ شبلی نعمانی نے مستند مآخذ کے حوالہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت عمرؓ فقہ سے خصوصی شغف رکھتے تھے اور وہ اس میدان میں امتیازی شان کے مالک تھے، انہوں نے واضح طور پر یہ لکھا ہے کہ "فقہ کا فن تمام تر حضرت عمرؓ کا ساختہ و پرداختہ ہے" اپنے خیال کی تائید میں انہوں نے متعدد صحابہ و تابعین کے اقوال کا حوالہ دیا ہے (۴) اور محدثین کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ صحابہ کرام میں چھ حضرات (حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ) پر علم فقہ کا مدار تھا، یہی حضرات مفتی کی خدمت انجام دیتے تھے اور کسی مسئلہ سے متعلق نص کی عدم موجودگی یا احادیث کے متعارض ہونے کی صورت میں اس کے حل کی بخوبی صلاحیت رکھتے تھے، (۵) مزید براں مصنف گرامی نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ تاریخ اسلام کے اولین دور میں مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ و شام فقہ کے معروف مراکز تھے اور ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی صحابی سے منسوب تھا اور ان صحابہ کرامؓ میں سے اکثر حضرت عمرؓ کے زیر تربیت رہے ہیں یا ان کی صحبت سے مستفید ہوئے تھے مثلاً حضرت عبداللہ بن عباسؓ (مکہ)، حضرت زید بن ثابتؓ (مدینہ)، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ (کوفہ) اور حضرت معاذ بن جبلؓ (شام) (۶)، اسی ضمن میں علامہ شبلی نے یہ صراحت بھی کی ہے کہ علم فقہ میں حضرت عمرؓ کو جو فضل و کمال حاصل تھا اس میں ان کی ذاتی ممارست کا کافی دخل تھا، فقہی مسائل پر مسلسل غور و فکر، نبی کریم ﷺ سے استفسار اور صحابہ کرامؓ سے مذاکرہ ان کے معمولات میں شامل تھا، بعض اوقات وہ مشکل و پیچیدہ مسائل کو لکھ لیتے، ان میں مسلسل غور و خوض

کرتے رہتے اور اپنے نتائج فکر بھی قلمبند کرتے ، کچھ مسائل ( مثلاً کلالہ کی نوعیت اور دادا کی میراث ) ایسے تھے کہ آخر وقت تک ان پر انفرادی واجتماعی غور وفکر کا سلسلہ جاری رہا لیکن انھیں اس باب میں تشفی نہ ہوئی (۷)، فقہ کی نسبت سے حضرت عمرؓ کا یہ امتیازی وصف الفاروق میں خاص طور سے ذکر کیا گیا ہے کہ وہ فقہی مسائل پر عمومی انداز میں غور وفکر کے علاوہ احکام شریعت کے مصالح وحکم معلوم کرنے میں بھی دلچسپی رکھتے تھے، اس سلسلہ میں اگر کسی حکم کے متعلق انہیں کوئی اشکال ہوتا تو وہ آں حضورﷺ سے رجوع فرماتے، جیسا کہ سفر میں نماز قصر کرنے کے باب میں انہوں نے یہ دریافت کیا تھا کہ اس کا حکم اس لئے دیا گیا تھا کہ راستے محفوظ نہ تھے اور دشمنوں کا خطرہ لگا رہتا تھا، جیسا کہ قرآن سے واضح ہوتا ہے، لیکن اب جب کہ راستے محفوظ ہو گئے تب بھی قصر کیا جاتا ہے، اس کی کیا وجہ ہے، نبی کریمﷺ نے اس کے جواب میں یہ ارشاد فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا انعام ہے۔

ان واقعات کے حوالہ سے صاحب الفاروق نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ پہلے شخص ہیں جنہوں نے علم اسرار الدین کی بنیاد ڈالی (۸)، فقہ کے میدان میں خلیفہ ثانی کی مہارت کی ایک اور وجہ فاضل مصنف نے یہ بیان کی ہے کہ دور فاروقی میں متعدد نئے ممالک مسلمانوں کے زیرنگیں ہوئے، ان میں معاشرت ومعیشت کے بہت سے نئے مسائل پیدا ہوئے، لوگ ان کے حل کے لئے مقامی قاضیوں ومفتیوں سے استفسار کرتے، یہ حضرات اہم و پیچیدہ مسائل میں جواب دینے سے قبل خلیفہ سے رجوع کرتے، اس طرح بہت سے غیر منصوص مشکل مسائل میں انہیں غور وفکر اور اظہار رائے کی ضرورت پیش آئی، یہی وجہ ہے کہ ان کے فتاوی کثرت سے ملتے ہیں جو ان کی مجتہدانہ فکر کے شاہد ہیں (۹)۔

علم فقہ میں مہارت کے ساتھ ساتھ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں فقہ کی تعلیم اور فقہی احکام کی ترویج کا بھی خاص اہتمام کیا، انہوں نے اس کے لئے مختلف شہروں میں ایسے صحابہ مامور کئے جو فقہ سے خصوصی شغف کے لئے معروف تھے، یہ ماہرین فقہ عام طور پر مساجد میں اپنا حلقۂ درس قائم کرتے اور لوگ وہاں اکٹھا ہو کر مسائل دریافت کرتے، بعض اوقات ان شہروں میں فقہی مسائل پر مذاکرہ کے دوران جب صحابہ کسی معاملہ میں کوئی تردد محسوس کرتے تو معلم فقہ سے رجوع کرتے (۱۰)، جمعہ کے خطبوں میں اور عام تقریروں میں ضروری احکام ومسائل بیان کرنا خلیفہ دوم کا معمول رہا ہے وہ



موقع کی مناسبت سے فقہی مسائل کی تشریح فرماتے مثلاً حج کا موقع ہوتا تو خاص طور سے حج کے مسائل بیان کرتے، شام وبیت المقدس کے سفر کے دوران خلیفہ نے جو خطبے دئے وہ کافی مشہور ہیں، صاحب الفاروق نے ان کی فقہی اہمیت بھی واضح کی ہے، ان میں اسلام کے ارکان اور فقہ کے اہم مسائل کی وضاحت کے علاوہ اصول فقہ کے بعض مسائل کا بیان بھی ملتا ہے، مثال کے طور پر جابیہ (شام) کے مقام پر آپ نے جو خطبہ دیا تھا اس میں حدیث سے اجماع پر استدلال فرمایا (۱۱)، حضرت عمرؓ نے فقہی احکام کی ترویج واشاعت کا ایک طریقہ یہ اختیار کیا تھا کہ وہ وقتاً فوقتاً اہم احکام لکھ کر صوبائی حکام و افسران کے نام بھیجتے اور ان کے توسط سے عوام میں انہیں مشتہر کراتے، ان تحریری ہدایت ناموں میں عام طور پر ان اہم مسائل کا بیان ہوتا، جنہیں خلیفہ صحابہ کے مشورے سے طے کرتے، بعض اوقات ان میں نئے پیش آمدہ مسائل پر صوبائی حکام کے استفسارات کے جوابات مذکور ہوتے، الفاروق میں ان مسائل میں نماز کے اوقات کی تعیین، جمع بین الصلوتین، نماز تراویح کی جماعت، زکوۃ سے متعلق تفصیلی احکام، نفلی روزہ کے بعض جزئی مسائل اور قضا وشہادت کے اصولوں کا حوالہ دیا گیا ہے، الفاروق میں ان مسائل سے متعلق حضرت عمرؓ کی ہدایات کی تفصیلات مندرج نہیں ہیں البتہ ان کے ماخذ (بالخصوص مؤطا امام محمد وازالۃ الخفا) کی نشاندہی کی ہے جن میں ان کی تفصیلات ملاحظہ کی جاسکتی ہیں (۱۲)۔

یہاں اس کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ حضرت عمرؓ افسران وعمال کے لئے فقہ سے واقفیت ضروری تصور کرتے تھے جیسا کہ صاحب الفاروق کے بیان سے واضح ہوتا ہے اور اہم بات یہ کہ فوجی افسران کے سلسلہ میں بھی خلیفہ اس پہلو کو ملحوظ رکھتے تھے، کتاب الخراج کے حوالہ سے انہوں نے یہ بیان کیا ہے کہ جب مسلمانوں کا کوئی لشکر تیار ہو جاتا تو خلیفہ اہل علم وفقہ میں سے کسی کو امیر بناتے (۱۳)، مزید براں ایک روایت کے مطابق خلیفہ کا یہ فرمان تھا کہ ہمارے بازار میں وہ شخص سامان نہ فروخت کرے جو تفقہ فی الدین نہیں رکھتا، شاہ ولی اللہ دہلوی نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تاجر کے لئے شرعی مسائل کا جاننا ضروری ہے (۱۴)، ان تمام باتوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ خلیفہ مختلف معاملات میں فقہ کو کس درجہ اہمیت دیتے تھے۔

الفاروق کے فقہی مباحث کا ایک اہم حصہ اصول فقہ سے تعلق رکھتا ہے، اس کے تحت الفاروق کے مصنف گرامی نے حدیث، قیاس واجماع سے متعلق فاروق اعظم کے اقوال اور ان سے فقہی مسائل

اخذ کرنے کے طریقہ کو واضح کیا ہے اور ان کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ استنباط مسائل کے اصول وضوابط مقرر کر کے خلیفہ نے اس علم کی بنیاد رکھی جو بعد کے دور میں مرتب ہو کر اصول فقہ کہلایا، مثال کے طور پر حدیث کے باب میں انہوں نے جو طرز عمل اختیار کیا اس سے یہ نکات واضح ہوتے ہیں:۔

۱۔ احادیث کو قبول کرنے یا ان سے اخذ مسائل سے قبل ان کی تحقیق وتفتیش ضروری ہے، راوی کے علاوہ متن کے اعتبار سے بھی ان پر نظر ڈالنی چاہئے۔

۲۔ خبر آحاد اسی وقت قبول کی جائے یا قابل حجت تسلیم کی جائے جب اس کی تصدیق کسی اور راوی سے مل جائے (۱۵)۔

۳۔ نبی کریم ﷺ کے اقوال وافعال سے اخذ مسائل کے وقت یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ ان کا تعلق منصب رسالت سے ہے یا بشری حیثیت سے ان کا صدور ہوا ہے (۱۶)۔

تیسرے امر کے سلسلہ میں صاحب کتاب نے یہ واضح کیا ہے کہ احادیث میں یہ فرق مراتب شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے قائم کیا ہے لیکن اگر بہ دقت نظر دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ اس تفریق کے موجد دراصل حضرت عمرؓ ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض مواقع پر انہوں نے رسول کریم ﷺ سے مختلف رائے ظاہر کی اور اپنی خلافت کے دوران بہت سے معاملات میں جداگانہ موقف اختیار کیا، اس سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اگر ان معاملات میں آنحضرت ﷺ کے اقوال وافعال کی حیثیت تشریعی ہوتی تو خلیفہ ان میں کمی وبیشی یا تبدیلی کی جرأت کیسے کرتے (۱۷)۔

اہم ومختلف فیہ مسائل کے فیصلہ کے لئے حضرت عمرؓ نے جو طریق کار اختیار کیا وہ اصلاً اجماع کی عملی شکل تھی جیسا کہ الفاروق کے مباحث سے واضح ہوتا ہے، خلیفہ گرامی کا یہ معمول تھا کہ وہ اہم ومختلف فیہ مسائل کے تصفیہ سے قبل صحابہ کرامؓ سے مشورہ کرتے اور ان کی اجتماعی رائے معلوم کرنے کے بعد ہی ان کی بابت فیصلہ صادر فرماتے، اس باب میں انساب الاشراف کے حوالہ سے بلاذری کا یہ قول نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کسی ایسے مسئلہ میں جو پہلے سے طے نہ ہو بغیر صحابہ کے مشورہ کے کوئی فیصلہ نہیں کرتے تھے (۱۸)، اسی طرح صوبائی حکام وافسران کے توسط سے اگر کسی فقہی مسئلہ کی تشہیر مقصود ہوتی تو پہلے اسے صحابہ کی مجلس میں پیش کرتے اور ان کی رائے معلوم کرنے کے بعد ہی اس سے متعلق ہدایت جاری فرماتے، یہی طرز عمل وہ ان مسائل میں بھی اختیار



کرتے جن میں صحابہ مختلف الرائے ہوتے، علامہ شبلی نعمانی نے حل مسائل کے لئے اس طریقہ کو کافی اہم قرار دیا ہے اور اس طور پر جو مسائل طے کئے گئے تھے انہیں "مسائل اجماعیہ" سے تعبیر کیا ہے، ان مسائل کو انہوں نے یکجا ذکر بھی کیا ہے البتہ یہ وضاحت کی ہے کہ ان کی تعداد کچھ کم نہیں ہے اور احادیث وآثار کے مجموعوں میں انہیں دیکھا جاسکتا ہے، پیش نظر کتاب میں مختلف مقامات پر اس نوع کے جن چند مسائل کا ذکر ملتا ہے وہ یہ ہیں نماز جنازہ کی تکبیرات کی تحدید، شرب خمر کی سزا کی تعیین، فئی کی تقسیم اور پہلی دوسری وتیسری بار چوری کرنے کی سزائیں اور مجوسیوں کی شرعی حیثیت (۱۹)۔

الفاروق میں اصول فقہ کی نسبت سے حضرت عمرؓ کا یہ کارنامہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے قیاس کے اصول وضوابط متعین کئے اور اس کے استعمال کو واضح شکل دی، مصنف گرامی نے اس خیال کو غلط قرار دیا ہے کہ قیاس کے موجد حضرت معاذ بن جبلؓ تھے، انہوں نے کہا کہ اس کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ حضرت معاذ نے یہ فرمایا تھا کہ اگر کسی مسئلہ میں "قرآن وحدیث سے کوئی وضاحت نہ ملے گی تو اجتہاد کروں گا"، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سے ان کی مراد قیاس نہیں تھی اس لئے کہ اجتہاد صرف قیاس پر منحصر نہیں ہوتا (الف ۱۹)۔

مزید براں ایک روایت کے حوالہ سے انہوں نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے دور تک فقہی مسائل قرآن، حدیث واجماع کے ذریعہ حل کئے جاتے تھے، اس وقت تک قیاس کا وجود نہ تھا (۲۰)، یہاں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ حضرت معاذ نے صرف اجتهد نہیں بلکہ "اجتهد برائی" فرمایا تھا، اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ پیش آمدہ نئے مسئلہ کو وہ اپنی رائے کے اظہار یا عقلی استدلال کے ذریعہ حل کرنے کی کوشش کریں گے یا یہ کہ وہ اپنی رائے یعنی قیاس کے ذریعہ اجتہاد کریں گے، دوسرے یہاں یہ بھی پیش نظر ہے کہ غیر منصوص مسائل کو اجتہادی عمل یا قیاس کے اصول کے مطابق حل کرنے کی بہت سی مثالیں حضرت عمرؓ کے زمانہ سے پہلے بھی ملتی ہیں، خود عہد نبوی ﷺ میں سفر کے دوران یا آپ ﷺ سے دور رہتے ہوئے بعض صحابہ نے کسی نئی صورت حال میں قرآن وحدیث سے واضح رہنمائی نہ ملنے پر اپنے اجتہاد کے مطابق عمل کیا اور جب بعد میں انہوں نے نبی کریم ﷺ کو اس کی اطلاع

دی تو آپ ﷺ نے ان کے عمل پر رضامندی ظاہر کی (۲۱)، البتہ یہ ضرور ہے کہ اس طرح کے مواقع پر پہلے قیاس کا لفظ استعمال نہیں ہوتا تھا بلکہ اسے اظہار رائے یا رائے کے ذریعہ اجتہاد کرنے سے تعبیر کیا جاتا تھا، دراصل رائے ہی کی منضبط و منظم شکل بعد میں ''قیاس'' کے نام سے معروف ہوئی، بہرحال قیاس کے اصول وقواعد وضع کرنے کے باب میں حضرت عمرؓ کی اولیت وافضلیت ثابت کرنے کے لئے انہوں نے گورنر کوفہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے نام خلیفہ کے اس تحریری ہدایت نامہ کا حوالہ دیا ہے، جس میں صاف طور پر یہ مذکور ہے:۔

**الفہم الفہم فی ما یختلج فی صدرک مما لم یبلغک فی الکتاب و السنة واعرف الامثال و الاشباہ ثم قس الامور عند ذالک۔**

یعنی جو چیز تم کو قرآن وحدیث میں نہ ملے اور تم کو اس کی نسبت شبہ ہو، اس پر غور کرو اور خوب غور کرو اس کے ہم صورت وہم شکل واقعات کو دریافت کرو، پھر ان سے قیاس کرو (۲۲)۔

اس روایت کو نقل کرنے کے بعد صاحب کتاب نے یہ تبصرہ فرمایا ہے کہ اصول فقہ کے ماہرین نے بعد میں جب قیاس کے تفصیلی اصول وضوابط وضع کئے تو اس کی دو بنیادی شرطیں متعین کیں، اول یہ کہ جس مسئلہ کے لئے قیاس کیا جائے وہ غیر منصوص ہو اور دوسرے یہ کہ مقیس و مقیس علیہ میں علت مشترکہ پائی جائے، حضرت عمرؓ کی مذکورہ ہدایت میں ان دونوں شرطوں کی صراحت ملتی ہے اس طرح قیاس کے باب میں خلیفہ کا یہ فرمان بنیادی اہمیت رکھتا ہے (۲۳)۔

فقہی ماخذ سے متعلق الفاروق میں جو اصولی مباحث ملتے ہیں ان کے علاوہ خلیفہ کے بیانات، اقوال اور فصل قضایا کے طریقوں سے احکام کے استنباط اور تفریع مسائل قواعد بھی واضح ہوتے ہیں، خلیفہ نے بہت سے مسائل صحابہ کی مجلس میں غور وفکر اور ان سے بحث ومباحثہ کے بعد طے کئے، ان مواقع پر انہوں نے جو تقریریں کیں یا کسی درپیش مسئلہ میں روایتوں کے اختلاف کی صورت میں فیصلہ لینے کے لئے انہوں نے جو طریق کار اختیار کیا ان سے نسخ، تخصیص وتطبیق کے بہت سے اصول قائم ہوگئے مثلاً ایک شخص نے ان کے سامنے یہ مقدمہ پیش کیا کہ میرے غلام نے میری اہلیہ کا آئینہ چرالیا ہے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا جائے، آپ نے مقدمہ پیش کرنے والے سے فرمایا کہ تمہارے غلام نے تمہاری ہی چیز چرائی ہے اس پر قطع ید کی سزا نہیں دی جاسکتی، اسی



طرح بیت المال سے ایک شخص کی چوری کا معاملہ آپ کے سامنے آیا تو اسے بھی اس بنا پر چھوڑ دیا کہ بیت المال میں ہر شخص کا کچھ نہ کچھ حق ہوتا ہے، اس سے یہ اصول مستنبط ہوا کہ حد سرقہ کا نفاذ اس وقت نہ ہوگا جب مال مسروقہ میں سارق کا کوئی حق ثابت ہو (۲۴)۔

الفاروق سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے کسی قانونی مسئلہ پر اظہار رائے یا افتاء کے اصول وضوابط بھی وضع کئے، ہر شخص فتویٰ دینے کا مجاز نہ تھا، کسی کو اس کی اجازت دینے سے قبل خلیفہ اس کی صلاحیتوں بالخصوص فقہی مہارت کا امتحان لیتے، مفتیوں کی تقرری کے بعد ان کے ناموں کے اعلان کا اہتمام فرماتے بعد میں وقتاً فوقتاً ان کا امتحان لیتے رہتے، ایک دفعہ حضرت ابوہریرہؓ سے ایک مسئلہ کا ذکر کرکے پوچھا کہ اس باب میں انہوں نے کیا فتویٰ دیا ہے اور جب انہوں نے اپنا جواب بیان کیا تو فرمایا کہ ''اگر تم اس مسئلہ کا اور کچھ جواب دیتے تو آیندہ تم کبھی فتوے کے مجاز نہ ہوتے'' (۲۵)۔

دور فاروقی کے مفتیوں میں حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابوہریرہؓ وحضرت ابودرداءؓ وغیرہم شامل تھے۔

الفاروق کے فقہی مباحث کا ایک بہت ہی قیمتی حصہ اہم ومختلف فیہ مسائل میں آپ کے فیصلوں اور اجتہادات سے تعلق رکھتا ہے، علامہ شبلی نے بعض اہم مسائل بالخصوص شرکائے جنگ میں مفتوحہ آراضی کی تقسیم، خمس غنائم میں آنحضور ﷺ کے اہل قرابت کا حصہ اور باغ فدک کے معاملہ میں خلیفہ کے فیصلوں کو بیان کرتے ہوئے ان سے متعلق صحابہ کے مابین مذاکرہ ومباحثہ کی پوری تفصیل پیش کی ہے، اس سے نہ صرف ان مسائل کی نوعیت واضح ہوتی ہے بلکہ خلیفہ اور ان سے اختلاف کرنے والوں کے دلائل بھی سامنے آتے ہیں، مزید براں بعد کے فقہاء نے ان مسائل کے بارے میں کیا موقف اختیار کیا، کتاب میں اس کی بھی مختصر وضاحت ملتی ہے، ان مسائل میں خلیفۂ وقت نے جو موقف اختیار کیا فاضل مصنف نے اس کی پرزور تائید کی ہے اور نقلی و عقلی دلائل سے اسے کافی مستحکم بنادیا ہے، انہوں نے اس نکتہ پر خاص زور دیا کہ حضرت عمرؓ نے ان مسائل کی بابت جو کچھ فیصلہ لیا وہ مصالح عامہ یا عام مسلمانوں کے مفاد کی رعایت پر مبنی تھا،

مثال کے طور پر شام وعراق کی مفتوحہ آراضی کو غانمین میں تقسیم نہ کرنا اس مصلحت کے تحت تھا کہ اس سے فوج کی تیاری اور مملکت اسلامیہ کی سرحدوں کی حفاظت اوران کے استحکام میں مدد ملے گی اور اس آمدنی سے نہ صرف موجودہ مسلمان بلکہ ان کی آئندہ نسلیں بھی متمتع ہوں گی، جیسا کہ اس مسئلہ پر اجتماعی مذاکرہ کی تفصیلات کے آخر میں صاحب کتاب نے یہ ذکر کیا ہے:۔

''حضرت عمرؓ کو دفعۃً قرآن مجید کی ایک آیت یاد آئی جو اس بحث کے لئے نص قاطع تھی یعنی لِلْفُقَرَاءِ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ ،اس آیت کے آخر فقرے'' جَاءُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ '' سے حضرت عمرؓ نے یہ استدلال کیا کہ فتوحات میں آیندہ نسلوں کا بھی حق ہے لیکن اگر فاتحین کو تقسیم کردیا جائے تو آنے والی نسلوں کے لئے کچھ باقی نہیں رہتا، حضرت عمرؓ نے کھڑے ہوکر نہایت پرزور تقریر کی اور اس آیت کو استدلال میں پیش کیا تمام لوگ بول اٹھے بے شبہ آپ کی رائے بالکل صحیح ہے، اس استدلال کی بنا پر یہ اصول قائم ہوگیا کہ جو ممالک فتح کئے جائیں وہ فوج کی ملک نہیں بلکہ حکومت کی ملک قرار پائیں گے اور پچھلے قابضین کو بے دخل نہیں کیا جائے گا'' (۲۶)۔

ان اختلافی مسائل کے علاوہ اور بہت سے مسائل پر حضرت عمرؓ نے اپنی فقہی رائے ظاہر کی، متعدد قدیم مسائل پر از سر نو غور کرکے ان سے متعلق اپنا فتویٰ صادر کیا، الفاروق میں شاہ ولی اللہ دہلوی کے حوالہ سے ایسے مسائل کی تعداد ہزار کے قریب بتائی گئی ہے، ان میں بہت سے وہ مسائل بھی شامل ہیں جنہیں ''اولیات عمرؓ'' کہا جاتا ہے، ان سے متعلق خلیفہ کے فتاویٰ سے ان کی مجتہدانہ شان بخوبی نمایاں ہوتی ہے، علامہ شبلی کے بقول ان میں سے اکثر مسائل میں صحابہ نے ان سے اتفاق کیا اور بعد کے ائمہ مجتہدین نے ان کی تقلید کی، الفاروق میں مختلف مقامات پر اس نوع کے مسائل زیر بحث آئے ہیں، کتاب کے آخر میں اولیات عمر کے تحت ۴۵ معاملات کی فہرست پیش کی گئی ہے جن میں تقریباً ۱۵ فقہی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں (۲۷)، بعض اہم مسائل جن سے متعلق خلیفہ کے فیصلوں وفتووں کو الفاروق میں نمایاں طور پر ذکر کیا گیا ہے وہ یہ ہیں، نماز تراویح کی جماعت کا قیام، نماز جنازہ کی چار تکبیروں کی تعیین، تجارت کے گھوڑوں پر زکوٰۃ کا نفاذ، سامان تجارت کے درآمد و برآمد پر عشور کے نام



سے نیا محصول مقرر کرنا، مختلف ممالک میں جزیہ کی مختلف شرح کا تعین، شرب خمر کی حد ۸۰ کوڑے متعین کرنا، قرآن، حدیث وفقہ کے معلمین کا مشاہرہ مقرر کرنا، بیت المال سے مفلوک الحال ذمیوں کے لئے وظیفہ جاری کرنا، امہات الولد کی خرید، فروخت کی ممانعت اور ہجو گوئی پر تعزیری سزا کا نفاذ۔

الفاروق میں ایک اہم فقہی بحث ذمیوں کے مسائل سے تعلق رکھتی ہے، اس سے متعلق اس میں مختلف مقامات پر جو بکھرا ہوا مواد ملتا ہے اس سے قطع نظر ذمی رعایا کے حقوق پر ایک مستقل باب بھی اس میں موجود ہے جو بیس صفحات میں پھیلا ہوا ہے اس کے مطالعہ سے جو اہم مسائل ابھر کر سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں:۔

۱۔ اسلامی حکومت اپنے ذمی باشندوں کے جان و مال کے تحفظ کی ذمہ دار ہے، ذمیوں کا خون مسلمانوں کے خون کے برابر ہے، کوئی مسلمان کسی ذمی کو قتل کرے تو اسے قصاص میں قتل کیا جاسکتا ہے۔ (۲۸)

۲۔ جزیہ ذمیوں کو تحفظ فراہم کرنے کا معاوضہ ہے جو ان کی استطاعت کے مطابق عاید کیا جائے گا، ان سے فوجی خدمت لینے یا ان کے تحفظ سے معذوری کی صورت میں جزیہ معاف کردیا جائے گا، اگر سال میں ایک دفعہ بھی انہوں نے فوجی خدمت انجام دی تو پورے سال کا جزیہ معاف ہوجائے گا، اسی طرح اگر حکومت انہیں تحفظ نہ فراہم کرسکی اور جزیہ وصول کرلیا گیا ہے تو اسے واپس کردیا جائے گا (۲۹)۔

۳۔ مقامی حالات کے اعتبار سے مختلف علاقوں میں اس کی مختلف شرح عاید کی جاسکتی ہے، نصف جنس ونصف نقد کی صورت میں بھی وصول کیا جاسکتا ہے (۳۰)۔

۴۔ نادار ومعذور ذمی بیت المال سے وظیفہ پانے کے مستحق ہوں گے، قرآن کریم میں صدقات کے مستحقین میں فقراء کے ساتھ مساکین کا ذکر ہے، فقراء سے مسلمان اور مساکین سے اہل کتاب غرباء مراد ہیں (۳۱)۔

۵۔ وضو کے لئے ذمیوں کا برتن اور اس کا پانی استعمال کرنا جائز ہے (یہاں یہ ذکر بے موقع نہ ہوگا کہ ازالۃ الخفا کے بیان کے مطابق نجران کے مسلمانوں کے استفسار پر حضرت عمرؓ نے یہ فرمایا تھا کہ عیسائیوں کے غیر آباد معبد میں نماز پڑھی جاسکتی ہے بشرطیکہ بیری کے پتہ کے ساتھ پانی کو

جوش دے کر اسے خوب دھویا جائے)(۳۲)۔

۶۔ ذمیوں کی مہمانی قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، انتظامی امور میں ان سے رائے ومشورہ لینا اور انہیں ملازمت دینا جائز ہے(۳۳)۔

الفاروق میں ذمیوں سے متعلق جو فقہی مسائل بیان کئے گئے ہیں ان کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ان کے سلسلہ میں خلیفہ کے احکام وفرامین ومعاہدات کے ذکر کے ساتھ مختلف مقامات پر ان کی عملی مثالیں بھی پیش کی گئی ہیں، بلکہ بعض مقامات پر خلیفہ کے طرز عمل سے فقہی نکات اخذ کئے گئے ہیں، الفاروق بنیادی طور پر تاریخ کی کتاب ہے اس لئے مسائل کے ضمن میں واقعات کو ذکر کرنا بہت برمحل اور نفس موضوع کے مطابق ہے، بیان وتبیین کے اس انداز نے الفاروق کے فقہی مباحث کو مفید اور قیمتی بنادیا ہے۔

الفاروق کے فقہی مباحث اس لحاظ سے بھی اہمیت رکھتے ہیں کہ وہ عام طور سے مستند مآخذ سے ماخوذ اور حوالوں سے مزین ہیں، البتہ بعض اہم مسائل (مثلاً گھوڑوں پر زکوۃ اور اسباب تجارت کے درآمد وبرآمد پر محصول عائد کرنے کے ضمن میں کسی ماخذ کا ذکر نہیں جو یقیناً تعجب خیز معلوم ہوتا ہے، الفاروق کے مآخذ میں احادیث کے مجموعے، فقہی کتب، سیرت وتاریخ اور صحابہ وتابعین، فقہاء وقضاۃ کے تذکرے بھی شامل ہیں، ان میں خاص طور سے صحیحین، مؤطا امام مالک، مؤطا امام محمد، سنن دارمی، کنز العمال، طبقات ابن سعد، فتوح البلدان، تاریخ طبری، تذکرۃ الحفاظ، اسد الغابہ، اخبار القضاۃ، طبقات الفقہاء، سیرت عمر بن الخطاب، کتاب الخراج، الاحکام السلطانیہ، ازالۃ الخفاعن خلافۃ الخلفاء قابل ذکر ہیں، الفاروق میں فقہی مسائل کے بیان میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی اہم تصنیف ازالۃ الخفا کا حوالہ بکثرت ملتا ہے، جس کا ایک حصہ حضرت عمرؓ کے فقہی کارناموں بالخصوص ان کے فتاوی واجتہادات کے تفصیلی بیان سے تعلق رکھتا ہے، جس کا اردو ترجمہ کتابی صورت میں "فقہ عمر" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، الفاروق کے مصنف گرامی نے بہت سے مقامات پر ا[illegible] الخفا کے اقتباسات بھی نقل کیے ہیں اور مختلف جگہوں پر اس کتاب کے حوالے سے [illegible] م آخذ کے بیانات درج کئے ہیں، اس کے باوجود علامہ شبلی نے شاہ ولی اللہ پر یہ نقد کیا ہے کہ انہوں نے ازالۃ الخفا میں محب طبری کی تالیف "الریاض النضرۃ" کو ماخذ کے طور



پر استعمال کیا ہے جب کہ اس کتاب میں موضوع اور ضعیف روایتیں بھی شامل ہیں (۳۴)، مزید براں ذمیوں کے حقوق سے بحث کرتے ہوئے انہوں نے کتاب مذکورہ کی اس روایت کو کمزور ومحل نظر قرار دیا ہے کہ حضرت عمرؓ صوبائی حکام کو عیسائی ملازم رکھنے سے منع کرتے تھے (۳۵)، مگر خود الفاروق میں فوجیوں کے اہل وعیال کی خبر گیری سے متعلق محب طبری کے حوالہ سے ایک روایت نقل کی گئی ہے [۱] لیکن حاشیہ میں اس کا کوئی مآخذ مذکور نہیں ہے (۳۶) ازالۃ الخفا میں بھی یہ روایت منقول ہے لیکن وہاں کسی کتاب یا مصنف کا حوالہ نہیں ملتا (۳۷)۔

غرض الفاروق کے فقہی مباحث کمیت وکیفیت دونوں لحاظ سے کافی اہمیت رکھتے ہیں، علم فقہ کا ارتقا، فقہ کی تعلیم اور فقہی احکام کی اشاعت کا اہتمام، مآخذ فقہ کے استعمال کے اصول، استنباط مسائل کے ضوابط، اہم ومختلف مسائل میں اجتماعی مذاکرہ ومباحثہ، خلیفہ کے فتاوی و اجتہادات جیسے متعدد امور زیر بحث آئے ہیں، بعض مسائل پر اس قدر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے کہ اس کے تمام پہلو منقح ہو کر سامنے آجاتے ہیں، یہ تمام مباحث مدلل انداز میں پیش کئے گئے ہیں اور اس کو معروف ومستند مآخذ کے حوالوں سے مزین ومستحکم کیا گیا ہے، مزید براں فقہی مسائل کی تشریح وترجمانی کے ضمن میں مصنف گرامی نے متعلقہ تاریخی واقعات بھی بیان کئے ہیں، اس سے ان مباحث کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔

---

[۱] معارف: بلاشبہہ علامہ شبلی نے ان کتابوں کی روایتیں نقل کرنے سے احتراز کیا ہے جن میں بکثرت موضوع اور ضعیف روایتیں موجود ہیں، اسی طرح بلند پایہ کتابوں کی موجودگی میں فروتر درجہ کی کتابوں کو بھی لائق استناد نہیں سمجھا ہے، لیکن جب کوئی واقعہ فروتر ہی درجہ کی کتابوں میں مذکور ہو تو وہاں اس کی صراحت کر کے کم درجہ کی کتابوں کی روایتیں بھی درج کی ہیں پھر واقعہ کی نوعیت کا بھی اعتبار کرتے ہیں، اگر وہ کم اہمیت کا حامل ہو اور بالکل ہی بعید از قیاس نہ ہو تو اس طرح کے واقعات کے ذکر میں مضائقہ نہیں سمجھتے اس کو ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے۔

## حواشی ومراجع

(۱) علی گڑھ میں علامہ شبلی کی مصروفیات پر تفصیلات کے لئے ملاحظہ کریں راقم کا مقالہ: علامہ شبلی اور علی گڑھ، فکر ونظر (شبلی نمبر) جون ۱۹۹۶ء، ص ۲۵۱۔ ۲۷۶۔ (۲) سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، مطبع

معارف، اعظم گڑھ ۱۹۷۰ء ص ۱۳۵-۱۳۷ - مکاتیب شبلی، مطبع معارف، اعظم گڑھ ۱۹۲۸ء، ص ۵۶-
۵۷ (۳) شبلی نعمانی، الفاروق معارف پریس، اعظم گڑھ ۱۹۵۶ء ص ۲ (دیباچہ) (۳ الف) انسٹی ٹیوٹ
گزٹ، ۲۸/۲۰-۱۰ مارچ ۱۸۹۳ء ص ۲۴۷، ظفر الاسلام اصلاحی، مولانا شبلی اور علی گڑھ، فکر و نظر، شبلی نمبر
جون ۱۹۹۶ء ص ۲۶۵-(۴) الفاروق، بحوالہ بالا ۲/۲۱۰-۲۱۱-(۵) الفاروق ۲/۲۱۲-۲۱۳-(۶)
الفاروق ۲/۲۱۱-(۷) الفاروق ۲/۲۱۵-۲۱۶-(۸) الفاروق ۲/۱۹۳-۱۹۴ (۹) الفاروق ۲/۲۱۶-
(۱۰) الفاروق ۲/۱۲۵-(۱۱) الفاروق ۲/۱۲۱-۱۲۲، نیز دیکھئے شاہ ولی اللہ دہلوی، ازالۃ الخفا عن خلافۃ
الخلفاء (متن مع اردو ترجمہ) (۱۲) الفاروق ۲/۱۲۲-۱۲۴-(۱۳) الفاروق ۲/۱۱۱-
۱۲۳-۱۲۴، ابو یوسف، کتاب الخراج، المطبعۃ السلفیہ، القاہرہ ۱۳۵۲ھ، ص ۱۹۳-(۱۴) ازالۃ الخفا
عن خلافۃ الخلفاء، ۳/۳۹۴-(۱۵) الفاروق ۲/۲۰۴-۲۰۵-۲۱۰-(۱۶) الفاروق ۲/۲۰۳-۲۱۸-
۲۲۰-(۱۷) الفاروق ۲/۲۱۹-۲۲۰-(۱۸) الفاروق ۲/۱۳۳-۱۲۴-۲۱۶-۲۱۷-احمد بن یحییٰ
البلاذری، انساب الاشراف (۱۹) الفاروق ۲/۱۳۳-۲۱۶-۲۱۷-۲۳۱-۲۳۲-ازالۃ الخفا، ۳/۴۵۴-
۴۹۶ (۱۹ الف) الفاروق ۲/۲۲۲-(۲۰) الفاروق ۲/۲۲۲-(۲۱) عہد نبوی و صحابہ میں مسائل کے حل
کے لئے قیاس کے استعمال کی مثالوں کے لئے ملاحظہ فرمائیں: عبدالصمد صارم ازہری، تاریخ الفقہ،
ادارہ علمیہ لاہور، ۱۹۶۳ء، ص ۱۳-۱۸، ۲۵-۲۹، حبیب الرحمٰن صدیقی کاندھلوی، اصول فقہ، قرآن محل
کراچی، ۱۹۶۳ء، ص ۲۴۷-۲۵۴-(۲۲) الفاروق ۲/۵۶-۵۷-۲۲۳-(۲۳) الفاروق ۲/۲۲۳-
۲۲۴-(۲۴) الفاروق ۲/۲۲۵، ازالۃ الخفا ۳/۴۵۴-(۲۵) الفاروق ۲/۶۴-۶۵-(۲۶) الفاروق
۲/۳۸-۳۹، ۲۳۱-۲۳۳-(۲۷) الفاروق ۲/۲۷۷-۲۸۰ (۲۸) الفاروق ۲/۱۳۸-۱۴۳
(۲۹) الفاروق ۲/۱۵۲-۱۵۴ (۳۰) الفاروق ۲/۱۵۴-۲۱۹ (۳۱) الفاروق ۲/۱۴۴-۲۷۹، ازالۃ الخفا
مقصد دوم ص ۷۳، مطبع صدیقی بریلی (۳۲) الفاروق ۲/۲۶۱-ازالۃ الخفا ۳/۵۱۷-(۳۳) الفاروق
۲/۲۹-۱۳۹-۲۶۱ (۳۴) الفاروق ۱/۱۴ (۳۵) الفاروق ۲/۲۶۲، ازالۃ الخفا ۳/۲۷۱
(۳۶) الفاروق ۲/۱۸۴-۱۸۵ (۳۷) ازالۃ الخفا ۳/۲۲۸-

☆☆☆☆☆



# سلطان محمد قلی قطب شاہ
# کی فارسی شاعری

ڈاکٹر عبدالرب عرفان مرحوم ☆

غزنین و غور سے ہندوستان کے خطۂ دکن تک فارسی زبان و ادب کے سفر کی داستان بہت طویل ہے، اس کا اختصار یہ ہے کہ فارسی زبان غزنوی اور غوری حملوں کے ساتھ ہندوستان آئی، غزنویوں نے صوبۂ پنجاب کا الحاق غزنین کی مملکت میں کیا اور غوریوں نے آگے بڑھ کر دہلی اور شمالی ہند پر بھی اپنا تسلط قایم کرلیا، جب شمالی ہند میں مسلمانوں کے قدم مضبوطی سے جم گئے تو توسیع مملکت کے ارادے سے علاء الدین خلجی (وفات ۷۱۶ھ-۱۳۱۶ء) نے دکن کا رخ کیا، اس وقت لازمی طور پر فارسی بھی اس کے لشکر کے ساتھ ۷۰۹ھ-۱۳۱۰ء میں دکن پہنچی، علاء الدین نے تلنگانہ کے شہر ارنگل کا محاصرہ کرلیا، ایک ماہ کی زد و خورد کے بعد وہاں کے فرماں روا رائے لدر دیو نے مسلمانوں کی اطاعت قبول کرلی اور ایک قرارداد کی رو سے سالانہ "جزیہ" ادا کرنا منظور کرلیا (۱)۔

تلنگانہ اڑتیس ۳۸ سال تک دہلی کی مرکزی حکومت کا زیر نگیں اور باج گزار (جزیہ گزار) رہا، ۷۴۷ھ/۱۳۴۷ء میں، جو سلطان محمد بن تغلق کی حکومت کا بائیسواں سال تھا، حسن کانگو (یا حسن گنگو) نامی امیر نے دکن کے دیگر امرا کو اعتماد میں لے کر علم بغاوت بلند کردیا اور قلعۂ دیوگیر پر قبضہ کرلیا، سلطان محمد بن تغلق نے اس شورش کا سر کچلنے کی دو سال تک کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوا، حسن کانگو نے "علاء الدنیا والدین ابوالمظفر بہمنشاہ" کا لقب اختیار کرتے ہوئے اپنی آزاد اور خود مختار حکومت کے قیام کا اعلان کردیا (۲)، اس طرح دکن میں سلسلۂ شاہانِ بہمنیہ کی داغ بیل

☆ غالب روڈ، وارث پورہ، کامٹی، ناگپور۔

پڑی اور فارسی زبان نے غزنین وغور سے ہندوستان کے خطۂ دکن تک کا اپنا طویل سفر پورا کیا، اس تاریخی تبدیلی کے سیاسی، ادبی اور ثقافتی نتائج بڑے دوررس ثابت ہوئے۔

بہمنی حکمراں جو اصلاً ایرانی ہی تھے، اپنے ساتھ صرف فارسی زبان ہی نہیں، فارسی شعروادب کا شستہ ذوق اور ایرانی تہذیب وتمدن کی دل نواز روایت بھی لائے تھے، انہوں نے اپنے مرکز حکومت کو علم وادب کا گہوارہ بنادیا، یہ واقعہ تاریخ میں بہت مشہور ہے کہ سلطان محمد ثانی بہمنی (۳) (جلوس: ۷۸۰ھ۔۱۳۷۸ء۔ وفات: ۷۹۹ھ۔۱۳۹۷ء) نے لسان الغیب خواجہ حافظ شیرازی (وفات: ۷۹۲ھ۔۱۳۹۰ء) کو دکن آنے کی دعوت دی تھی اور زادراہ کے لئے ایک خطیر رقم بھی بھیجی تھی لیکن حافظ نے معذرت کے خط کے ساتھ ایک غزل بھیج دی تھی جس کا مطلع اور ایک شعر جو بہت مشہور ہوا، درج ذیل ہیں:

دمے با غم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد — بمے بفروش دلق ما کزیں بہتر نمی ارزد
شکوہ تاج سلطانی کہ بیم جاں درو درجست — کلاہ دلکش است اما بترک سر نمی ارزد (۴)

بادشاہ نے حافظ کے نہ آسکنے کے عذر کو قبول کرتے ہوئے ایک ہزار طلائی سکہ انہیں تحفے میں بھیج دیا۔

بہمنی خاندان کی حکومت دوسوسال تک قایم رہی لیکن رفتہ رفتہ کمزور ہوتی گئی، انجام کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ سال ۹۰۰ھ۔۱۴۹۵ء میں یہ حکومت پانچ چھوٹی حکومتوں یعنی گولکنڈہ، بیجاپور، احمد نگر، برار اور بیدر میں تقسیم ہوگئی (۵)۔

**قطب شاہی حکومت**

قطب شاہی خاندان کی خود مختار حکومت کی بنیاد سلطان قلی قطب شاہ نے ۹۲۴ھ۔۱۵۱۸ء میں ڈالی (۶) اور قلعۂ گولکنڈہ کو اپنا دار الحکومت بنایا، اس حکمراں خاندان کے سات افراد یکے بعد دیگرے بادشاہ بنے، آخری بادشاہ ابوالحسن تانا شاہ تھا جس نے ۱۰۹۸ھ۔۱۶۸۷ء میں مغل شہنشاہ ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب عالم گیر (وفات ۱۱۱۸ھ۔۱۷۰۷ء) کے ہاتھوں شکست کھائی اور اس حکومت کا الحاق مغلیہ سلطنت میں ہوگیا (۷)۔

سلطان قلی بڑا علم دوست اور ادب نواز بادشاہ تھا، خود بھی شعر کہتا تھا لیکن اس کی مدت حکومت کا بیشتر حصہ میدان جنگ میں بسر ہوا، اس کے باوجود وہ علم وفن کی سرپرستی سے غافل نہیں



رہا، علمی اور ادبی سرگرمیوں کو تیز تر کرنے اور شعروادب کو ترقی کے آسمانوں کی سیر کرانے کے لئے اس نے کئی قدم اٹھائے، ان میں سے ایک ''آتش خانہ'' کے نام سے ایک محل کی تعمیر ہے، یہ محل ایک طرح سے سلطان قلی کی علمی اور ادبی اکادمی تھی، یہاں شاعر، ادیب اور اہل ذوق حضرات جمع ہوتے اور بادشاہ بھی شرکت کرتا اور سب کے ساتھ شعراء کے کلام سے مستفید ومحظوظ ہوتا تھا (۸)۔

اس سلسلۂ خاندان کے سبھی بادشاہ شعروادب کا بڑا ستھرا ذوق رکھتے تھے، خود بھی شعر کہتے تھے اور شعرا کی قدر شناسی اور سرپرستی میں بھی کوئی کسر باقی نہیں رکھتے تھے، یہی سبب تھا کہ ان کا دربار شعرا، ادبا، علما اور فضلا کے لئے کعبۂ مراد بن گیا تھا، ابراہیم قلی قطب شاہ کے زمانۂ حکومت (۹۵۷ھ۔۱۵۵۰ء تا ۹۸۸ھ۔۱۵۸۰ء) میں نہ صرف سلطنت کو سیاسی نقطۂ نگاہ سے استحکام حاصل ہوا بلکہ شعروادب کی سرپرستی میں بھی نئے ابواب کا اضافہ ہوا، اب فارسی، عربی اور ترکی کے ساتھ ملکی اور علاقائی زبانوں یعنی تلنگی اور دکھنی کو بھی شاہی سرپرستی حاصل ہوگئی اور گولکنڈہ علم وادب کا ایک ممتاز مرکز بن گیا۔

**محمد قلی قطب شاہ**

تاہم اس سلسلۂ خاندان کو ہنوز اس فرماں روا کا انتظار تھا جس کو سیاست کی دنیا کا بادشاہ تو ہونا ہی تھا، جہانِ شعروسخن کی فرماں روائی بھی قضا وقدر کے کاتب نے جس کے مقدر میں لکھ رکھی تھی، اس فرماں روا سے مراد خانوادۂ قطب شاہیہ کا پانچواں تاجدار سلطان محمد قلی قطب شاہ (ولادت: ۹۷۱ھ۔۶۴۔۱۵۶۳ء۔ تخت نشینی: ۹۸۸ھ۔۱۵۸۰ء۔ وفات: ۱۰۲۰ھ۔۱۶۱۲ء) ہے، اس کا عہد حکومت قطب شاہیوں کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا، جنگوں کا سلسلہ بند ہوچکا تھا اور ہر طرف صلح وآشتی کی فضا قایم ہوچکی تھی، ایسے وقت میں فنون لطیفہ یعنی شعروادب، رقص وموسیقی، مصوری ومجسمہ سازی، فن تعمیر وغیرہ ترقی کی منزلیں بڑی سرعت کے ساتھ طے کرتے ہیں بشرطیکہ بادشاہ صاحب ذوق اور ان فنون کا رمز آشنا ہو۔

محمد قلی قطب شاہ گوناگوں خوبیوں کا مالک اور متنوع اوصاف سے متصف تھا، ارباب تذکرہ اور مورخین کسی استثنا کے بغیر اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ یہ بلند اقبال حکمراں ''تمام صوری اور معنوی صفات میں اپنے بھائیوں پر فضیلت رکھتا تھا'' (۹) علم وفضل کے بلند مرتبے پر فائز تھا، وہ ایک باہمت اور دلیر جوان تھا اور فنون حرب میں کامل مہارت رکھتا تھا، اس کا شمار قطب شاہی سلسلۂ

خاندان کے قابل ترین اور مقتدر ترین بادشاہ کی حیثیت سے ہوتا ہے، اس کے بارے میں تاریخ قطب شاہی کے مولف کا بیان ہے کہ علوم عقلی و نقلی میں اس کی معلومات مکمل تھیں، تاریخ کے مطالعے کی گہرائی کا یہ عالم تھا کہ اگر مورخان عصر کسی واقعے کا بیان شروع کرتے تھے تو بادشاہ اسے انجام تک پہنچا دیتا تھا، وہ ہمیشہ ارباب علم و فضل کی صحبت میں رہتا اور ان کے ''افادات دانش مندانہ'' سے مستفید ہوتا تھا، نظم و نثر میں اس کا مرتبہ بہت بلند تھا (۱۰)۔

**محمد قلی کی دکھنی شاعری پر فارسی کے اثرات**

محمد قلی قطب شاہ تین زبانوں کا مستند شاعر تھا، دکھنی، فارسی اور تیلگو، وہ دکھنی میں معانی تخلص کرتا تھا اور فارسی میں قطب شہ، اس کی دکھنی شاعری موضوعات کی رنگا رنگی اور زبان و اسلوب کی ندرت کے لحاظ سے اردو شاعری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے، گو اس کے غالب حصے کی فضا پر علاقائی رنگ غالب ہے لیکن جا بجا فارسی زبان و شاعری کے اثرات بہت نمایاں ہیں، اس کی غزل بلحاظ موضوع شعرائے متقدمین کے عشقیہ کلام سے مختلف نہیں، تمام تر سرمایہ عشق، سرمستی اور تصوف کے مضامین سے بھرا پڑا ہے لیکن روانی اور شستگی کے اعتبار سے اس کی ایک انفرادی شان ہے۔

محمد قلی کی دکھنی غزلیں پڑھ کر صاف طور پر محسوس ہوتا ہے کہ اس نے فارسی شاعری اور خصوصاً حافظ کا غائر مطالعہ کیا ہے، دکھنی غزلوں کے اشعار میں فارسی ترکیبوں کے بے تکلف استعمال سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے، نمونے کے بطور بعض ترکیبیں پیش کی جاتی ہیں:۔

شرط وفا، روئے زیبا، لعل شکر خا، فرح بخش ساعت، مرید پیر میخانہ، لعل شراب آلود، سلیماں فر، سرچشمۂ آب حیات، عیش روز الست، خال ہندو، شاخ نبات، آب حیات، بنفشہ رنگ، مستی خیز، گریز، فرح بخش، سرخوش، دردمند عشق، سلیماں تخت، سیارو چشم، دیدۂ یعقوب، گریۂ ایوب، نوش دارو، خوش نظر باز، تر کتاز۔

یہ اور ایسی بے شمار ترکیبیں محمد قلی کے دکھنی کلام میں بکھری پڑی ہیں، ان میں سے ایک بڑی تعداد خواجہ حافظ شیرازی کی غزلوں سے ماخوذ ہیں، محمد قلی کی فارسی سے اثر پذیری کی انوکھی اور دلچسپ مثالیں وہ اشعار ہیں جن میں شاعر نے فارسی زبان کے افعال قافیوں کے بطور استعمال کئے ہیں، یہ اشعار قارئین کے لئے دلچسپی کا سامان فراہم تو کرتے ہی ہیں، لسانیاتی نقطۂ نگاہ سے



بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں، چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:۔

او بال پن میں دسیا جو بناں کا ملکا تخت   او تول بیٹھیں مو دل بھانڈہ کانچ کا بشکست

مکھ عرق میں زور مستی ہے عجب   میری مکھ زردی میں رنگ لعل بست

داکھ دانے انگلیاں کی بوٹ ہیں   رنگ بوٹاں میں مئے عناب ہست

زاہدا کیا پند کہے اے بے خبر   رب کی حکمت میں سو گنج حکمت است

تری کمر کوں سراہے ہیں باد تھے نازک   او باد گانٹھ کنے عقل تھے کدیں نگشاد

ہے بڑائی جو ہمن شمع پہ تم نور پڑے   پوچھو خورشید کوں کس تھے تجھے یہ نور رسید

نیند بہانے سونین جب تھہی اپنے مونچ   ساحراں کا سبھی سحر اسی لحظہ درید (۱۱)

یہ اور اس طرح کی دوسری مثالیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ محمد قلی کی دکھنی شاعری پر فارسی شاعری ہی کے نہیں، فارسی زبان کے بھی گہرے اثرات تھے، اس لحاظ سے محمد قلی کے دکھنی کلام کی لسانیاتی اہمیت بھی ہے، محمد قلی نے اپنے بعض دکھنی اشعار میں فارسی کے متعدد بڑے اور مشہور شاعروں کے نام لئے ہیں، یہ بات فارسی زبان و ادب سے اس کی غیر معمولی دل چسپی اور گہرے لگاؤ کا بین ثبوت ہے، اس نے ایران کے جن مشہور شاعروں کے نام لئے ہیں ان میں انوری، خاقانی، نظامی، عنصری اور ظہیر فاریابی قابل ذکر ہیں، ایک شعر میں اس نے خود کو خاقانی کا ہم پلہ قرار دیا ہے اور دوسرے میں اپنے آپ کو اپنے عہد کا انوری، باقی شعرا کے نام تعلیوں میں آئے ہیں، لیکن خواجہ حافظ شیرازی کا نام کمال تعظیم و احترام کے ساتھ لیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسے حافظ سے بے حد عقیدت تھی اور اسی عقیدت نے اس سے حافظ کے مضامین اور ان کی شاعری کے بنیادی عناصر اور ڈکشن سے خوشہ چینی کی بھی تحریک دی اور حافظ کی متعدد غزلوں کے دکھنی منظوم ترجمے بھی کروائے، ان ترجموں کو دیکھ کر ایسا نہیں لگتا کہ زبان ہدف (Target Language) یعنی دکھنی اردو اپنے سفر ارتقا کے ابتدائی مراحل طے کر رہی تھی، ان ترجموں کے پیش سلطان محمد قلی کو حافظ کا پہلا مترجم قرار دیا جانا چاہئے، قارئین کی دلچسپی کے لئے ذیل میں حافظ کی تین غزلوں کے مطلعے اور دو غزلوں کے ایک ایک شعر بھی نقل کئے جاتے ہیں اور ان کے مقابل ان کے ترجمے:۔

| حافظ | قطبشہ |
|---|---|
| یوسف گم گشتہ باز آید بکنعان غم مخور | یوسف گم سو پھر آ گا اب بہ کنعان غم نکھا |
| کلبۂ احزاں شود روزے گلستاں غم مخور | گھر ترا امید کا ہوگا گلستاں غم نکھا |
| اے دل غمدیدہ حالت بہ شود دل بدمکن | اے ہیانیہ دکھ دکھیا سوں خوب ہوگا حال تج |
| ویں سر شوریدہ باز آید بساماں غم مخور | غم کا چنتا ہویگا پھر آ کہ جاناں غم نکھا (۱۳) |
| بعزم توبہ سحر گفتم استخارہ کنم | منگیا جو توبہ کے تیں صبح استخارہ کروں |
| بہار توبہ شکن میرسد چہ چارہ کنم | ہنگام توبہ توڑن آیا کیا میں چارہ کروں |
| سخن درست بگویم، نمی توانم دید | درست بات کتا ہوں نہ جاسے تجہ تے دیکھا |
| کہ مے خورند حریفان و من نظارہ کنم (۱۴) | شراب پیویں حریفاں و میں نظارہ کروں (۱۵) |
| گل بے رخ یار خوش نباشد | پھل بن رخ یار خوش نہ دیسے |
| بے بادہ بہار خوش نباشد (۱۶) | بن مد پھلی جھاڑ خوش نہ دیسے (۱۷) |

یہ مثالیں فارسی اور دکھنی دونوں زبانوں پر محمد قلی کی قدرت تامہ کی آئینہ دار اور ترجمے کے فن میں اس کی غیر معمولی مہارت کی بین دلیل ہیں، اس کے کلیات سے اس بات کا وافر ثبوت ملتا ہے کہ وہ خواجہ حافظ شیرازی کا زبردست معتقد اور مقلد تھا، خواجہ کی تقلید کے ثبوت اس کے یہاں قدم قدم پر ملتے ہیں اور اس نے اپنے بعض اشعار کے لئے خواجہ کے اشعار سے بجنسہ بھی مضمون اٹھائے ہیں اور قدرے ترمیم کے ساتھ بھی، یہ شعر ملاحظہ فرمائیں:۔

دنیا کا حکمت نابوجھیں ہر گز حکیماں علم سوں — گاوترنا عیش کا نس دن پیا کے نام پر (۱۸)

یہ شعر خواجہ حافظ شیرازی کے مندرجہ ذیل کا چربہ ہے:۔

حدیث از مطرب دے گو و راز دہر کمتر جو — کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا (۱۹)

ان اشعار کا رنگ و آہنگ بھی دیکھئے:۔

مرید پیر میخانہ ہوا ہوں دیکھ اے زاہد — ہماری مے پرستی میں تمن تسی ریا ہے اب (۲۰)

کہاں کیخسرو و دارا و سکندر جمشید — دل پیالے میں بھریں ساقی شراب لبریز (۲۱)

**قطبشہ کا فارسی دیوان** کسی شاعر کے کلام کا ناقدانہ جائزہ لینے اور اس کی شاعرانہ



حیثیت کا تعین کرنے کے لئے اس کے دیوان یا کم از کم اس کے کلام کے معتدبہ حصے کا دسترس میں ہونا ضروری ہے، قطبشہ نے دکھنی دیوان کے ساتھ ہی اپنا فارسی دیوان بھی مرتب کیا تھا جو اب ناپید ہے (۲۲)، فارسی کلام کا جتنا کچھ حصہ دست برد زمانہ کی نذر ہونے سے بچ رہا وہ عبارت ہے، ساٹھ غزلوں، تین متفرق اشعار، کربلا کے شہیدوں کا مرثیہ (چھ بند) اور ایک نوحہ سے، اتنے قلیل کلام کے پیش نظر ایک دیوان کے مشمولات کی خوبیوں اور خامیوں کا جائزہ لینا ایسا ہی ہے جیسے چند کلیوں پر انحصار کر کے پورے چمن کے رنگ و بو کو قیاس کرنا، مگر فی الوقت اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں، ہو سکتا ہے مستقبل میں دیوان قطبشہ کی بازیافت ہو اور اسے زیور طبع سے مزین کر کے شائقین کے ہاتھوں تک پہنچایا جاسکے، یہ دیوان شاہی کتاب خانے میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کی نظر سے گذرا ہے، انھوں نے اس کے ایک صفحے کا عکس رسالہ اردو بابت ماہ جنوری ۱۹۲۲ء میں شائع کیا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مذکورہ سال اور اس کے بعد بھی ایک عرصے تک وہ دیوان مذکورہ بالا کتاب خانے کی زینت رہا ہوگا، اسے ناپید ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔

**قطبشہ کی فارسی شاعری** یوں تو قطب شاہی سلسلۂ خاندان کے تقریباً سبھی فرماں رواؤں نے فارسی میں شعر کہے ہیں لیکن ان میں محمد قلی قطب شاہ کی حیثیت گل سرسبد کی سی رہی ہے، اس نے فارسی زبان و ادب کا مطالعہ بڑی گہرائی کے ساتھ کیا تھا، جہاں اس کی فارسی شاعری کا تعلق ہے، وہ حافظ شیرازی سے بے حد متاثر تھا، اتنا کہ کبھی کبھی اس کے بعض اشعار پر حافظ کا شعر ہونے کا گمان گزرتا اور کبھی وہ حافظ کی کسی غزل سے کوئی شعر گنگناتا جو اسے پسند رہا ہو تو لوگوں کو خیال ہوتا کہ بادشاہ شاید اپنا ہی کوئی شعر گنگنا رہا ہے، ایسی ہی غلط فہمی کی ایک مثال بعض تذکروں میں پائی جاتی ہے، اس کی تفصیل تاریخ فرشتہ کے مولف کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں، رقم طراز ہے:۔

| | |
|---|---|
| ''علی الدوام مجلس خرمی و بزم بے غمی آراستہ | وہ ہمیشہ عیش و طرب اور بے غمی کی مجلس آراستہ |
| از زمانۂ ناپایدار داد کامرانی می ستاند و | کرتا اور زمانۂ ناپایدار سے داد کامرانی وصول |
| بزبان حال بدیں ترانہ مترنم می گردد: | کرتا اور زبان حال سے یہ شعر ترنم کے ساتھ گنگناتا تھا: |
| ہر وقت خوش کہ دست دہد مغتنم شمار | جو اچھا وقت ہاتھ آجائے اسے غنیمت جان کیوں کہ |
| کس را وقوف نیست کہ انجام کار چیست'' (۲۳) | کسی کو یہ معلوم نہیں کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ |

یہ شعر بلاشبہ خواجہ حافظ شیرازی کا ہے (۲۴)، لیکن چونکہ قطبشہ کی شاعری بھی اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے، اس لئے ارباب ذوق یہاں تک کہ خود صاحب تاریخ فرشتہ نے سہواً اسے بادشاہ کا شعر سمجھ لیا اور یہ شعر اس کے نام سے تذکروں میں راہ پا گیا، چنانچہ کلام الملوک کے مصنف میر سعادت علی رضوی نے محمد قلی قطبشہ کے بکھرے ہوئے فارسی اشعار اور غزلوں کو محبوب الزمن، تاریخ قطب شاہی اور حدائق السلاطین سے نقل کر کے اپنی تالیف ''کلام الملوک'' میں یکجا کر دیا ہے، ان شعروں اور غزلوں میں پہلا شعر یہی ہے (۲۵) اور یہ محمد قلی قطبشہ کی حافظ پسندی اور حافظ پرستی کا کھلا ثبوت ہے۔

قطب شہ کی فارسی اور دکھنی دونوں زبانوں کی شاعری کا خمیر عشق، تصوف اور رندی و سرمستی کے جذبات سے اٹھا ہے، یہی تینوں عناصر حافظ کی شاعری کے بھی اجزائے اعظم ہیں، اس کی فارسی شاعری میں رنگ حافظ کے صوفیانہ لب و لہجے والے شعر دیگر اشعار کے تناسب میں زیادہ ہیں، صوفیانہ عقائد و افکار اور عیاشی و سرمستی کے مضامین کی جذبات انگیز خیالات کی آمیزش کے ساتھ فنکارانہ پیش کش جو بہت کم شاعروں کے یہاں نظر آتی ہے، حافظ کی غزلیہ شاعری سے براہ راست اثر پذیری کا نتیجہ ہے، اس اعتبار سے حافظ کی غزل قطبشہ کے لئے ایک بڑے سرچشمے کا درجہ رکھتی ہے، اس دعوے کی دلیل کے طور پر قطبشہ کے چند فارسی شعر جن میں حافظ کا رنگ صاف طور پر نظر آتا ہے، نقل کئے جاتے ہیں:۔

مستان محبت بد و عالم نفر و شند    کیفیت تہ جرعۂ پیانۂ خود را
من غم عالم ندارم عاشقی کارمنست    پادشاہ کشور عشقم خدا یارمنست
منکر زاہد نہ ایم و زہد، و لیکن    دل سرد پر وائے خانقاہ ندارد
ساقی بیار بادہ کہ فصل بہار شد    صحن چمن زآب و ہوا لالہ زار شد
ما اقتدا بشرب مدام تو کردہ ایم    پرکن پیالۂ کہ زمان خمار شد
ہر جرعۂ ززہر غضب نوش کردہ ام    ازدست آں نگار مرا سازگار شد (۲۶)

یہ اشعار سادگی، صفائی، روانی اور سلاست کے بھی بڑے دلآویز نمونے ہیں، خیال کی ندرت، اسلوب کی دل کشی اور زبان کی شگفتگی کے ساتھ معنی آفرینی، فکر کی بلندی اور نازک خیالی کا



عالم بھی دیدنی ہے، مثالاً یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:۔

با یاد تو عاشق نکشد منت خورشید    بستیم در روزنۂ خانۂ خود را
گر ہمہ عمرم نظر بروے تو باشد    دیدہ بجز حسرتو نگاہ ندارد
تا برخسار جہاں سوز تو کارم افتاد    روش سوختن آتش تر دانستم
لطفی نمودہ سوے خود آں نازنیں بخواند    مارا ز بے وفائی او ایں گماں نبود
چشم فلک ز رشک مقیمان بزم تو    چوں دیدۂ صراحی مے اشکبار شد (۲۷)

قطبشہ کی شاعرانہ خوبیوں میں اسلوب کی شگفتگی اور زبان کی شستگی کو بھی نمایاں حیثیت حاصل ہے، چوں کہ عشق مزاجی فطرت میں رچی بسی تھی اس لئے اشعار میں درد و غم کا فقدان ہے، اسی لئے اسے معشوق کے غم میں سینکڑوں جنتیں پوشیدہ نظر آتی ہیں:۔

دل در غم او یافتہ صد جنت پنہاں    چوں عذر بخواہم غم جانانہ خود را (۲۸)

زبان و بیان کی دلآویزی، اسلوب کی جاذبیت اور لب و لہجے کی دل کشی اس کمی کو محسوس نہیں ہونے دیتی، وہ الفاظ کا ماہر نبض شناس اور ان کے مناسب محل استعمال کے گر سے پوری طرح واقف ہے، اس بیان کی صداقت درج ذیل اشعار سے بخوبی واضح ہوتی ہے:۔

در رہ نیست دلا نیست ضرر دانستم    سخن اہل غرض بود خطر دانستم
خوش بحد بود دلم کز تو وفا می آید    شکر باری کہ ترا بار دگر دانستم
گہے تغافل و گاہے سلام می سوزد    چہ گویمت کہ دلم را کدام می سوزد (۲۹)

قطبشہ نے معنی آفرینی اور اشعار کی تزئین و آرائش کی خاطر شعری صنعتوں کے حسن استعمال سے بھی کام لیا ہے، تشبیہ، استعارہ، تضاد، تلمیح، مراعات النظیر، ایہام، مبالغہ، تجنیس، اشتقاق اور دیگر صنعتیں اس کے دستیاب اشعار میں موجود ہیں، مثلاً:۔

تشبیہ و استعارہ: ہوش و خرد ازپاے در افتد چومستاں    چوں سرمہ کشی نرگس مستانۂ خود را
تضاد: خرابیہا کہ دل از ترکتاز غمزۂ دارد    فداے آں خرابی باد معموری و آبادی
تلمیح و تشبیہ: بملک عشق ازسد سکندر کس نمی گوید    دریں ملک مبارک رہ ندارد سست بنیادی
مراعات النظیر: دلے کز دوست نالاں شد پریشاں گشت حیراں شد    مسلماناں مبادا ہیچکس از دوست فریادی

تجنیس محرف بیں کہ چہ طوفان آتشست زعشقش آئینۂ دل کہ تاب آہ ندارد (۳۰)
وشبہ اشتقاق

قطبشہ نے بعض غزلیں حافظ کی زمینوں میں کہی ہیں، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس نے حافظ کے رنگ سخن کی کامیاب اور مکمل پیروی کی ہے، لیکن اس سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ قطبشہ کی نظر میں حافظ کی غزلیں اپنی نظیر نہیں رکھتیں، فی الوقت ہماری دسترس میں صرف ایک غزل ہے جو قطبشہ نے حافظ کی زمین میں کہی ہے، اس کے چند شعر سطور ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں لیکن پہلے حافظ کی غزل کا مطلع ملاحظہ فرمائیں:-

روشنی طلعت تو ماہ ندارد — پیش تو گل رونق گیاہ ندارد

اسی زمین میں قطبشہ کہتا ہے:-

ملک محبت کہ داد خواہ ندارد — ملک چنیں ہیچ پادشاہ ندارد
گر ہمہ عمرم نظر بروے تو باشد — دیدہ بجز حسرت نگاہ ندارد
گو بچہ انگیز درد و غم بسر ما — مرد محبت غم از سپاہ ندارد
بیں کہ چہ طوفان آتشست زعشقش — آئینۂ دل کہ تاب آہ ندارد
تکیہ گہ قطب شاہ چوں دگراں نیست
جز کرم دوست تکیہ گاہ ندارد (۳۱)

قطبشہ نے اپنی غزلوں کے لئے زمینوں کے انتخاب میں کمال سلیقہ مندی کا ثبوت دیا ہے، بحریں اشعار کے مضامین اور ان کے موڈ سے پوری مطابقت رکھتی ہیں، ردیف وقوافی کی مناسبت ان میں بڑی خوش آہنگی اور دل فریبی پیدا کردیتی ہے، درج ذیل اشعار سے اس معروضے کی بخوبی تائید ہوتی ہے:-

با شمع مگو گرمی دیوانہ خود را — کاتش زند از رشک تو پروانہ خود را
من غم عالم ندارم عاشقی کار منست — پادشاہ کشور عشقم خدا یار منست (۳۲)

ایک غیر مردف غزل کے تمام مصرعوں میں قوافی تکرار کی ہے، اس سے پوری غزل میں ایک فرحت بخش، ترنم خیز اور طرب انگیز خوش آہنگی اور نغمگی پیدا ہوگئی ہے، اس کے علاوہ قوافی



تکرار سے شاعر نے ہر شعر کے مضمون ومفہوم کو کسی نہ کسی معنوی اور فنی خوبی سے آراستہ کیا ہے، غزل پڑھتے وقت محسوس ہوتا ہے کہ اس میں سلاست اور روانی کا سیلاب ہے کہ امڈا چلا آرہا ہے جو قارئین کے ذہنوں کو اپنے ساتھ بہائے لئے جارہا ہے، یہ غزل سہل ممتنع کی بہترین مثال ہے، ذیل میں پوری غزل نقل کی جاتی ہے:-

حرفے زلب یار شنیدیم شنیدیم — صد شکر کہ این بادہ چشیدیم چشیدیم
مردم ہمہ صد درد سر بیہدہ دارند — گر درد سر از بادہ کشیدیم کشیدیم
اعجاز محبت منگر کم کہ دریں را — بے بال و پر از شوق پریدیم پریدیم
ایں بسکہ تماشائے گلستاں تو کردیم — گر میوۂ وصل تو نچیدیم نچیدیم
ہرچند کہ وحشت دل آں نیست کہ گوید — از یار ستمگر چو رمیدیم رمیدیم
اے قطبشہ از درد دل خویش چہ گوئیم
مشتاق تراز خویش ندیدیم ندیدیم (۳۳)

سلطان محمد قلی قطب شاہ کی فارسی غزل گوئی کا یہ جائزہ تشنہ اور نامکمل ہے کیوں کہ یہ اس کے فارسی دیوان کے گلشن کی چند کلیوں پر قناعت کرکے لیا گیا ہے، اگر پورا دیوان جواب پردۂ خفا میں ہے، پیش نظر ہوتا تو اس کی فارسی غزل گوئی کے اور بھی کئی پہلو نظر میں آئے ہوتے، اس کی صوفیانہ اور عشقیہ شاعری جس میں رندی وسرمستی کے مضامین کی بھی آمیزش ہے، خود اس کے زمانے میں بہت مقبول رہی ہے، اگرچہ درج ذیل شعر برائے شعر گفتن معلوم ہوتا ہے لیکن تذکروں اور تاریخوں کی فراہم کردہ اطلاعات سے اس امر کی توثیق ہوتی ہے کہ:-

چوں محمد قطبشہ از عشق می گوید سخن
عاشقاں را آرزوے طرز گفتار منست (۳۴)

## حواشی

(۱) ہسٹری آف انڈیا، ج ۳، ایلیٹ اینڈ ڈاسن (تاریخ علائی از امیر خسرو۔ انگریزی ترجمہ) ص ۸۴
(۲) ہسٹری آف قرونہ ترکس، ج ۱، ایشوری پرساد، الہ آباد ۱۹۳۶ء ص ۲۴۵ (۳) حدایق السلاطین کے مولف نے تاریخ فرشتہ کا اتباع کرتے ہوئے اس کا نام محمود بن علاء الدین حسن بہمنی لکھا ہے

(۴) دیوان حافظ، باہتمام محمد قزوینی و دکتر قاسم غنی، تہران، ص ۱۰۳ (۵) دکن میں اردو، نصیر الدین ہاشمی، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ ۱۹۶۳ء ص ۳۰ (۶) تاریخ گولکنڈہ، پروفیسر صدیقی، ص ۲۵ (۷) منتخب اللباب، ج ۲، خافی خاں، کلکتہ، ص ۶۲-۶۱ ۳ (۸) اردو شہ پارے، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ص ۸۰ (۹) تاریخ قطب شاہی، قادر خاں بیدری، ۱۳۳۹ھ ص ۲۲۶ (۱۰) ایضاً ص ۳۱۹ (۱۱) کلیات سلطان قلی قطب شاہ (دوسرا حصہ) مرتبہ ڈاکٹر زور، ص ۴۴، ۴۸، ۴۸، ۹۰، ۹۰، ۹۱ (۱۲) دیوان حافظ، باہتمام محمد قزوینی ص ۱۷۲، ۱۷۳ (۱۳) کلیات سلطان قلی قطب شاہ (دوسرا حصہ) ص ۹ (۱۴) دیوان حافظ، باہتمام محمد قزوینی ص ۲۳۰ (۱۵) کلیات سلطان قلی قطب شاہ (دوسرا حصہ) ص ۱۷۵ (۱۶) دیوان حافظ، باہتمام محمد قزوینی ص ۱۱۱ (۱۷) کلیات محمد قلی قطب شاہ، دوسرا حصہ ص ۲۵۶ (۱۸) ایضاً ۱۱۵ (۱۹) دیوان حافظ باہتمام قزوینی، ص ۴ (۲۰) کلیات محمد قلی قطب شاہ، دوسرا حصہ ص ۳۳ (۲۱) ایضاً ۱۲۲ (۲۲) کلام السلوک، مرتبہ میر سعادت علی رضوی، ۱۳۵۷ھ ص ۴۵ (۲۳) تاریخ فرشتہ، ج ۲ ص ۱۷۵ (۲۴) دیوان حافظ، باہتمام قزوینی، ص ۴۵ (۲۵) کلام السلوک، ص ۳۶ (۲۶) ایضاً ص ۳۶، ۴۷، ۴۸، ۵۳، ۵۳، ۵۳ (۲۷) ایضاً ص ۴۷، ۴۸، ۵۰، ۵۲، ۵۳ (۲۸) ایضاً ص ۴۷ (۲۹) ایضاً ص ۴۹، ۵۰، ۵۳ (۳۰) ایضاً ص ۴۶، ۵۱، ۵۱، ۵۱، ۴۸ (۳۱) ایضاً ص ۴۸ (۳۲) ایضاً ص ۴۶، ۴۷ (۳۳) ایضاً ص ۴۹ (۳۴) ایضاً ص ۴۸

☆☆☆☆☆





# سنسکرت، ہندی اور مسلمان

از جناب محمد بدرالدین صاحب☆

اس موضوع پر گو اس سے پہلے بہت لکھا جا چکا ہے، خصوصاً علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی اور مرحوم سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے اس پر بڑے مفید مضامین اور کتابیں لکھی ہیں، لیکن اب بھی اس موضوع پر برابر مضامین لکھے جانے کی ضرورت ہے۔

مسلمانوں نے ہندوستانی علوم و ادبیات اور سنسکرت اور ہندی زبانوں سے ہمیشہ بڑی دلچسپی لی ہے، اس سلسلے میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، اس مضمون میں اس کی ایک جھلک دکھائی جائے گی اور مسلمانوں کی خدمات کے نقوش کو نمایاں کیا جائے گا۔

تفسیر و احادیث کی بعض کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک ہندوستان کی عظمت و تقدس مسلّم، علامہ سیوطیؒ نے "درمنثور" نامی اپنی کتاب میں ابن جریر، حاکم، بیہقی اور ابن عساکر کے حوالے سے حضرت علیؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:۔

اطیب ریحاً ارض الھند آب و ہوا کے لحاظ سے ہندوستان کی سرزمین سب سے زیادہ اچھی ہے۔

علامہ سیوطیؒ نے اس مضمون کی روایتیں بھی نقل کی ہیں کہ حضرت آدمؑ جنت سے نکالے جانے کے بعد ہندوستان میں اتارے گئے اور اپنے ساتھ وہاں کی خوشبو اور آب و ہوا بھی لے کے آئے، ایک فارسی شاعر نے اسی معنی کو اپنی زبان میں اس طرح ظاہر کیا ہے:۔

☆لائبریری و انفارمیشن اسسٹنٹ، خدابخش لائبریری پٹنہ۔

ہندوستاں کہ نعم البدل فردوس است　　آدم زبہشت ہیں کہ افتاد بہ ہند

اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ ہندوستان جنت کا نعم البدل ہے یہی وجہ ہے آدم کو جنت سے ہندوستان کی سرزمین میں اتارا گیا۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ یہ روایتیں اگرچہ اہلِ فن کے نزدیک پایہ اعتبار سے ساقط ہیں، پھر بھی ان سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان کی عظمت و اہمیت مسلمانوں کے دل میں جاگزیں تھیں، آزاد بلگرامی نے اپنی کتاب غزلان الہند میں شیخ علی رومی کی کتاب محاضرۃ الاوائل و مسامرۃ الاواخر سے نقل کیا ہے کہ :-

''سب سے پہلے جس مقدس زمین پر کتابیں تصنیف کی گئیں اور جہاں سے علم و عرفان کے چشمے جاری ہوئے، وہ ہندوستان کی سرزمین ہے''۔

امیر خسروؒ نے اپنی کتاب ''نہ سپہر'' میں ایک مستقل باب ہندوستان کی عظمت کا قائم کیا ہے، جس میں انہوں نے صرف علوم کے اعتبار سے ہندوستان کی برتری کے دس دلائل پیش کئے ہیں، وہ ہندوستانی مذاہب کو بھی اسلام کے بعد دنیا کے سب سے افضل و اعلیٰ مذاہب کے درجے میں شمار کرتے ہیں۔

مشہور عباسی خلیفہ منصور کے زمانے میں بغداد کے لوگ ہندوستانی علوم و فنون سے اچھی طرح واقف ہو چکے تھے اور ان سے متعلق کئی کتابوں کے ترجمے عربی زبان میں ہو چکے تھے، ہارون رشید کے وقت تک ہندوستانی علوم و فنون اور ادبیات پر مشتمل کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ بغداد میں دستیاب تھا، یحیٰ برمکی نے ہارون رشید کی دلچسپیوں کو دیکھ کر مختلف علوم و فنون سے متعلق کتابوں کے ترجمے مہیا کرانے پر خصوصی توجہ دی، اس نے ترجمہ کے فن کو ترقی دینے کے لئے بیت الحکمت قائم کیا اور ہندوستان کے کئی پنڈتوں اور مشہور عالموں کو بغداد بلوایا، ان میں کنکہ اور شانی بھلہ معروف پنڈت ہیں جو تراجم کے کام پر مامور کئے گئے تھے، ان عالموں کے ذریعہ ہندوستانی طب وادویہ وغیرہ کا بہت بڑا علمی ذخیرہ بغداد پہنچا۔

ہارون رشید کے دور حکومت میں ہی ہندوستان کے ایک مشہور و معروف طبیب و فلسفی منکہ بغداد بلائے گئے اور انہیں شعبہ تراجم کا رکن اور مرکزی شفاخانے کا ناظم اور حاکم اعلیٰ مقرر کیا



گیا، سنسکرت کی کئی اہم کتابوں کا انہوں نے ترجمہ بھی کیا تھا، جن میں فلسفہ و حکمت اور علم طب کی کتابیں خصوصی اہمیت کی حامل تھیں، ایک کتاب ''سامیکا'' کا بھی انہوں نے ترجمہ کیا تھا۔

فلسفہ و حکمت میں بلند درجہ و مرتبہ کے حامل ہندوستانی عالموں میں چانکیہ کی کتابوں کا بھی عربی میں ترجمہ ہوا، ان کے علاوہ کئی ویدوں، طبیبوں، فلسفیوں اور علم نجوم کے ماہروں کی کتابوں کے ترجمے بھی ہارون رشید کے دور حکومت میں ہوئے۔

مسلمانوں میں سنسکرت اور ہندی زبانوں کی تعلیم و تدریس کا رواج بھی تھا اور وہ علم نجوم، آیوروید اور ہندوستانی حکمت و فلسفہ میں بھی اعلیٰ قابلیت رکھتے تھے، تاریخ کے اوراق میں متعدد ایسے عالموں کے نام ملتے ہیں جنہوں نے ان علوم و فنون اور ادبیات و لسانیات میں مہارتِ تامہ حاصل کر لیا تھا اور سنسکرت کی کئی کتابوں کے ترجمے بھی کئے تھے، ایک عالم نے سنسکرت کی ایک کتاب کا ترجمہ کیا تھا اور اس کا عربی نام ''مرأۃ المعانی لادراک عالم الانسانی'' رکھا تھا، محمد بن اسماعیل تنوخی نے ہندوستان کا سفر کیا اور یہاں کئی سالوں تک رہ کر علم حاصل کیا، ابومعشر فلکی نے دس برسوں تک یہاں قیام کر کے سنسکرت زبان و ادب کا علم حاصل کیا، ابوریحان البیرونی اس میدان میں سب سے گوئے سبقت لے گئے، یہ ہندوستانی علوم و فنون کے سب سے بڑے عالم و فاضل تھے، سولہ سال کی عمر میں ہی سنسکرت زبان میں مہارتِ تامہ حاصل کر چکے تھے، انہوں نے ہندوستانی علوم و فنون پر ایک مبسوط کتاب ''کتاب الہند'' کے نام سے ۱۰۳۰ء میں لکھی جس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے، اس کے علاوہ بہت سی قدیم کتابوں کے خلاصے اور ترجمے کئے، کچھ عربی کتابوں کا ہندوستانی زبان میں بھی ترجمہ کیا۔

شہنشاہ اکبر سے سینکڑوں سال پہلے کشمیر کے حکمراں سلطان زین العابدین نے جو ہندی اور تبتی زبانوں کی واقفیت بھی رکھتے تھے، اپنے قلم رو میں ایک آزاد محکمہ تعلیم کی بنیاد رکھی جس میں فارسی اور عربی زبانوں کی کتابیں ہندوستانی اور سنسکرت زبانوں میں ترجمہ کی گئیں، اسی طرح سنسکرت اور ہندی زبانوں کی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا ''مہابھارت'' اور ''راج ترنگی'' کا فارسی ترجمہ ہوا، فرشتہ کا بیان ہے:-

''شاہ بر جمیع زبان ہا از فارسی، ہندی، تبتی　　شاہ زین العابدین فارسی، ہندی، تبتی وغیرہ

وغیر آن مروجہ کمال مہارت داشت، زہمہ آنہا حرف می ازدو فرمودہ اکثری از کتب فارسی و عربی بہ زبان ہندی و کتب ہندی بہ زبان فارسی ترجمہ کردند، کتاب "مہابھارت" کہ از کتب مشہورۂ ہنداست بہ فارسی ترجمہ کردند، کتاب "راج ترنگنی" کہ عبارت از بادشاہان کشمیراست در عہد او تصنیف شدہ"۔

مروجہ زبانوں میں پوری مہارت رکھتے تھے، ان سے بات چیت بخوبی کرتے اور احکام جاری کرتے تھے، فارسی و عربی کی اکثر کتابوں کا ہندی زبان میں اور ہندی کتابوں کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا، "مہابھارت" جو کہ ہندوستان کی مشہور کتابوں میں سے ایک ہے، اس کا فارسی میں ترجمہ کیا، "راج ترنگنی" نامی کتاب جو بادشاہان کشمیر کی تاریخ پر مشتمل ہے، اس کی تصنیف اسی کے دور حکومت میں ہوئی۔

سیر المتاخرین میں جگہ جگہ ایسی باتیں درج ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ہندوستانی زبان و ادب اور علوم و فنون کی تعلیم و تحصیل، نشر و اشاعت اور فروغ و ترقی کے لئے مسلمان ہمیشہ سے کوشاں رہے ہیں، انہیں جہاں کہیں بھی علم و حکمت کا سراغ ملتا اسے اپنی گمشدہ متاع سمجھ کر اسے حاصل کرتے ......... طباطبائی اسی کتاب میں فیروز شاہ کے متعلق رقم طراز ہیں:۔

"فیروز شاہ کانگڑہ کا قلعہ زیر نگیں کرنے کے بعد جب جوالا مکھی دیکھنے گیا تو وہاں کے کتاب خانے کو بھی دیکھا جہاں برہمنوں کے آباء و اجداد کے (۱۳۰۰) مخطوطات محفوظ تھے، فیروز شاہ وہاں کے عالموں سے ملے اور ان کتابوں کے بارے میں معلومات حاصل کی، اس کے بعد حکم دیا کہ ان کتابوں میں سے چند اہم کتابوں کا فارسی ترجمہ کیا جائے تاکہ اس کے معانی آسانی سے سمجھے جاسکیں، حسب فرمان مولانا محمد عزالدین نے ان میں سے علوم عامہ کے موضوع پر ایک کتاب کا انتخاب کیا اور اس کا فارسی میں ترجمہ کر کے "کتاب فیروز شاہی" نام رکھا جسے فیروز شاہ نے بہت پسند کیا"۔

فیروز شاہ کے دور حکومت میں ہندی زبان مسلمانوں میں بڑی مقبول تھی، اس دور کے مسلمانوں میں ملا داؤد کا نام سر فہرست ہے، ان کی کتاب "چندائن" کو خدا بخش لائبریری، پٹنہ نے ۱۹۹۶ء میں پہلی بار فارسی رسم الخط میں شائع کر دیا ہے، ناگری رسم الخط ڈاکٹر پرمیشوری لال گپت نے ۱۹۶۴ء میں ممبئی سے چھپوایا تھا اور ہندی ودیا پیٹھ، آگرہ سے ۱۹۶۲ء میں اور وشو ودیالیہ



پرکاشن، بنارس کے ۱۹۶۷ء میں اس کے ہندی ایڈیشن منظر عام پر آچکے ہیں۔

سرکاری طور پر ہندوستانی زبانوں کے استعمال کی مثال ہمیں ابراہیم عادل شاہ کے یہاں ملتی ہے، فرشتہ لکھتا ہے:۔

ابراہیم "عادل شاہ نے سب ہی سرکاری کاغذات اور رجسٹروں سے فارسی "بر طرف ساختہ" یعنی فارسی کو نکال کر اس کی جگہ ہندوستانی زبانوں کا استعمال کیا"۔

غزنوی عہد کے مشہور شاعر مسعود سلمان سعد نے ہندوستانی زبان میں اپنے کلام کا دیوان مرتب کیا، امیر خسرو نے سنسکرت اور ہندی بھاشا میں درجۂ کمال حاصل کیا۔

شیر شاہ کے عہد حکومت میں ملک محمد جائسی ہندی بھاشا کے اتنے بڑے شاعر تھے کہ خود ہندوؤں میں آج تک ان کے مقابلے کا کوئی شاعر نہیں ہوا، ان کی "پدماوت" کو عالمی شہرت حاصل ہے، گو ہندوستان کے تمام مسلم حکمرانوں کے دور میں ہندوستانی علوم و فنون اور زبان و ادبیات کو فروغ حاصل ہوا مگر مغلیہ سلطنت کے دور کو اس کا زریں عہد مانا جاتا ہے، اس دور میں اس کی توسیع و ترقی کی رفتار تیز تر رہی، کیوں کہ مغل بادشاہوں اور شاہزادوں نے سنسکرت پڑھنے کے علاوہ دیگر ہندوستانی علوم و فنون میں بھی مہارت حاصل کی۔

ہمایوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے بڑی تعداد میں قدیم سنسکرت کی کتابوں کو جمع کیا تھا اور ان کتابوں کا روزانہ مطالعہ کیا کرتا تھا، اس کی وفات بھی کتب خانے کی سیڑھیوں سے گر کر ہوئی تھی۔

شہنشاہ اکبر کے عہد میں سنسکرت کی متعدد کتابوں کا ترجمہ فارسی میں ہوا، اس نے اپنے دربار میں بڑے بڑے پنڈتوں اور سنسکرت زبان کے مشہور و ماہر فاضلوں کو جمع کیا تھا، اسی زمانے میں سنسکرت سے بے شمار کتابوں کا ترجمہ ہوا جن میں سے چند کے نام ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ بھگوت گیتا مترجم فیضی
۲۔ ہربنس (کنہیا جی کے بارے میں) مترجم مولانا شیرازی
۳۔ رامائن مترجم سعد اللہ مسیح سلطان تھانیسری
۴۔ رزم نامہ خلاصہ رامائن مترجم نقیب خاں
۵۔ اتھروید مترجم حاجی ابراہیم سرہندی
۶۔ رامائن مترجم حاجی ابراہیم سرہندی

۷۔ بلہاوتی مترجم فیضی ۸۔ نل دمن مترجم فیضی
۹۔ راج ترنگنی ......... ۱۰۔ مہابھارت .........

اس سے اس کے دور میں ترجموں کی وسعت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اکبر بادشاہ کے ذریعہ اس وسیع پیمانے پر سنسکرت کے ترجمے کرانے کی وجہ سے ہندی بھاشا کو بہت زیادہ فائدہ ہوا، بھاشا کی اتنی مقبولیت بڑھی کی امراء، منصب دار اور شاہزادے تک ہندی بھاشا میں شاعری کرنے لگے، عبدالرحیم خان خاناں اس دور کے بڑے مشہور و معروف ہندی کے شاعر ہیں، یہی وہ دور ہے جس میں تصنیف و تالیف اور ترجموں میں ادبی اصطلاحات کا استعمال کثرت سے ہونے لگا تھا۔

جہاں گیر کے دور حکومت میں بھی ہندوستانی علوم وفنون اور زبان وادبیات پر خصوصی توجہ دی گئی، خود جہاں گیر بادشاہ بڑے بڑے پنڈتوں، سنیاسیوں اور عالموں کی زیارت کے لئے جنگلوں، پہاڑوں اور دور دراز مقامات کے سفر کی صعوبتیں برداشت کرکے جاتا تھا ان سے ہندو مذہب کا علم حاصل کرتا تھا، اس دور کے مشہور شاعروں میں غواصی کا نام سرفہرست آتا ہے جنہوں نے ہندی بھاشا میں مہارت وشہرت حاصل کی تھی، انہوں نے ہی ''طوطی نامہ'' لکھی تھی، اس دور کے ملانوری بھی ہندی بھاشا کے مشہور شاعر ہیں، اکبر اور جہاں گیر کے زمانے میں جو لوگ شہرت کے بام عروج پر پہنچے، ان میں ایک اہم اور مشہور نام شیخ شاہ محمد کا بھی ہے۔

اورنگ زیب عالم گیر کو ایک خوفناک اور ظالم حکمراں کی حیثیت سے شہرت دے دی گئی ہے، لیکن اس کے دور حکمرانی میں ہندی بھاشا کی جتنی توسیع وترقی ہوئی اور سرکاری سطح پر ہندی زبانوں پر جتنی توجہ دی گئی اتنی اس سے پہلے کبھی نہیں دی گئی تھی، اس دور کے مشہور شاعروں میں ضمیر جو منصب دار تھا ہندی زبان میں مہارت رکھتا تھا، دآنا نام کا ایک شاعر بھی اس دور میں بڑی شہرت رکھتا تھا، شیخ مصطفی انسان اس دور کے بہت بڑے عالم تھے، انہیں ہندوستانی علوم وفنون کا بحر بیکراں تسلیم کیا جاتا ہے، آزاد بلگرامی نے ''سرو آزاد'' میں لکھا ہے کہ شیخ غلام مصطفی سے بڑے بڑے برہمن اور سنسکرت زبان کے ماہرین مذہبی علوم حاصل کرتے تھے، ہندی کے بڑے بڑے شاعر انہیں اپنا کلام دکھاتے اور اصلاح لیتے تھے، ان کے علاوہ عبدالجلیل بلگرامی بھی ہندی زبان



کے منتخب شاعروں میں تھے، اس ضمن میں داراشکوہ کا ذکر لابد ہے، جس کی کتابیں عالمگیر شہرت کی حامل ہیں، جوگ بشسٹ ترجمہ منہاج السالکین، خدابخش لائبریری پٹنہ سے ۱۹۹۲ء میں شائع ہوچکی ہے اور اپنشد (سرا کبر) ایران سے چھپی ہے۔

محمد شاہ کے دور میں نظام الدین بلگرامی، خیرالدین بلگرامی کے بیٹے رحمت اللہ اور قاسم دریابادی بھاشا کے بڑے نامور عالموں میں شمار کئے جاتے ہیں، رحمت اللہ کو تو اس دور کے مشہور ہندی شاعر چنتامنی نے بھی اپنا استاد تسلیم کیا ہے، قاسم دریا آبادی کی کتاب ''ہنس جواہر'' بڑی مشہور ہے۔

مغلوں نے سنسکرت اور ہندی زبانوں کو مروج کرنے میں ہر ممکن کوشش کی جس کے نتیجے میں اس عہد کے ہندو راجے مہاراجے بھی عربی وفارسی کتابوں کے ہندی ترجمے کرانے میں پیش پیش رہے، ان راجاؤں میں جے پور کے راجا جے سنگھ کا نام سرفہرست ہے جنہوں نے عربی زبان کی مشہور کتاب ''شرح چغمنی'' کا ہندی ترجمہ کرایا، اس کے علاوہ بھی ان کے دور میں بہت سی عربی وفارسی کتابوں کے ہندی زبان میں ترجمے ہوئے۔

ہندی زبان وادبیات کی ترویج وتوسیع میں گراں قدر خدمات انجام دینے میں مندرجۂ ذیل حضرات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

۱۔ اعظم خاں سنگاررس (۱۷۳۹ء) ۲۔ یوسف خاں شرح رشک پریا (۱۷۶۳ء)
۳۔ یوسف خاں سار چند (۱۷۸۰ء) ۴۔ کاظم علی سنگھاسن بیتی (۱۸۰۱ء)
۵۔ بختیار خاں سی سار

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو ہندوستانی علوم وفنون اور زبان وادبیات سے ہمیشہ والہانہ تعلق رہا ہے، غرض ہندوستان کے کسی مسلم فرماں روا کا دور بھی سنسکرت و ہندی زبان وادبیات اور دیگر ہندوستانی علوم وفنون کے مسلم ماہرین سے خالی نہیں رہا، ہندوستان میں ہندی بھاشا اور سنسکرت کی ترویج وتوسیع اور درس وتدریس کا تقابلی تجزیہ کیا جائے تو یہ خود بخود ثابت ہوجائے گا کہ مسلمانوں کے آنے کے بعد اس میں اضافہ ہوا ہے، خاص طور پر سنسکرت کو عام لوگوں تک پہنچانے میں ان کی نمایاں خدمات رہی ہیں۔

## مصادر و مراجع


عربی: الفہرست ابن الندیم، دار المعرفۃ، بیروت ۱۹۹۴ء۔ طبقات الاطباء، ابن ابی اصیبعہ

فارسی: اہل ہند، ابوالقاسم طباطبائی، خدا بخش لائبریری، پٹنہ ۱۹۹۵ء۔ تاریخ فرشتہ، قاسم فرشتہ، نول کشور، لکھنؤ ۱۸۶۲ء (دو جلدیں)۔ توزک جہاں گیری، مرتبہ سید احمد علی، نظامی پریس، کانپور، ۱۲۸۸ھ۔ جہاں گیر نامہ، خدا بخش لائبریری، پٹنہ، ۲۰۰۰ء۔ سرو آزاد، آزاد بلگرامی، دخانی پریس، لاہور، ۱۹۱۳ء۔ سیرت فیروز شاہی، خدا بخش لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۹ء۔ سیر المتأخرین، علامہ حسین طباطبائی نول کشور، لکھنؤ، ۱۸۹۷ء۔ غزلان الہند، آزاد بلگرامی۔ مآثر الامراء، مصنفہ صمصام الدولہ شاہنواز خاں، مرتبہ پروفیسر ایوب قادری، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۶۸ء (تین جلدیں)۔ منتخب التواریخ، عبد القادر بدایونی، کالج پریس، کلکتہ، ۱۸۶۸ء۔ نہ سپہر، امیر خسرو، بپٹسٹ مشن پریس، کلکتہ، ۱۹۴۷ء۔

اردو: ادبیات عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی، انگریزی، خدا بخش لائبریری، پٹنہ ۱۹۹۹ء۔ ادبیات ہندی ایضاً ایضاً۔ بابر نامہ، مترجمہ نصیر الدین گورگانی، ملک الکتاب، بمبئی، ۱۳۰۸ھ۔ تاریخ ہند، خدا بخش لائبریری، پٹنہ ۱۹۹۳ء۔ عہد وسطی کی ہندی ادبیات میں مسلمانوں کا حصہ، خدا بخش لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۵ء۔ مکاتیب مرزا مظہر جان جاناں، خدا بخش لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۵ء۔ ہندوستان کے عہد وسطی پر مقالات، ایضاً ایضاً۔ ہندو دھرم اکبر کے عہد میں، ایضاً ایضاً۔ ہندو دھرم ہزار برس پہلے، ایضاً ایضاً۔ ہندی ادبیات ایضاً ایضاً۔ چندائن ایضاً ایضاً ایضاً۔

ہندی: اورنگ زیب ایک نئی درشٹی، خدا بخش لائبریری، پٹنہ ۱۹۹۰ء۔ چندائن، ہندی گرنتھ رتنا کر، دلی، ۱۹۶۴ء۔ جے سری گرنتھاولی، پنڈت رام چندر شکل۔ ہندی بھاشا اور اس کے ساہتیہ کا وکاس۔ ہری اودھ، ہندی ساہتیہ کا آلوچ ناتمک اتہاس، ڈاکٹر رام کمار ورما ۱۹۶۴ء

انگلش:
Amir Khusrau As a Historian-Khuda Bakhsh, Library, Patn -1992.

Hindustan During Mughal India - Khuda Bakhsh, Library, Patna -1998.

Religion & Society in India of 10th Century - " " " 1994.

Religion & Society in India of 13th Century - " " ".




# طالبات کی اقامتی درسگاہیں

## چند قابل غور باتیں

از جناب انیس چشتی صاحب☆

''مضمون نگار نے اس مضمون میں جو نکات اور سوالات اٹھائے ہیں وہ بہ جائے خود محل نظر ہیں، عہد رسالت وغیرہ میں لڑکیوں کی اقامتی درسگاہ کا نہ ہونا ان کے عدم جواز کا ہونا ثبوت نہیں، آج ان کے لئے اقامتی درسگاہیں، نیک جذبہ اور قومی و ملی ضرورت کے پیش نظر ہی قائم کی جارہی ہیں، ہر چیز میں مثبت اور منفی دونوں پہلو ہوتے ہیں اقامتی درسگاہوں کی بعض خرابیوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا تاہم ان کی خوبیاں بھی مسلمہ ہیں، مقالہ نگار نے صرف منفی پہلوؤں کو ذکر کیا ہے جو یقیناً محتاج اصلاح اور ارباب مدارس کی توجہ کے لائق ہیں''۔(ض)

۱۹۶۰ء کے بعد واقع ہونے والے تعلیمی دھماکے نے عالم تعلیم و تعلم کو دگرگوں کر کے رکھ دیا ہے، اس سیلاب سے تیسری دنیا کے ممالک بھی نہیں بچ پائے ہیں، افریقہ کے گھنے جنگلات میں رہنے والے پگمیوں سے لے کر بھارت کے بنوں میں رہنے والے آدیباسی بھی اپنے بچوں کو اسکول بھیجنے لگے ہیں، چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے ساری دنیا کا خواندگی گراف پچھلی کئی صدیوں کے مقابلے میں بلندیوں کو چھونے لگا ہے۔

اس تعلیمی دھماکے نے دینی میدان میں کام کرنے والے کارکنوں کو بھی بہت متاثر کیا ہے،

---

☆ ۱۹۷۔ گنج پیٹھ۔ پونے۔

شہر شہر، قریہ قریہ دینی تعلیم کے لئے چھوٹے بڑے مدارس کھولے جارہے ہیں، قرآن کریم کی ابتدائی ناظرہ تعلیم کے مکتبوں سے لے کر دورۂ حدیث یعنی اعلیٰ دینی تعلیم کی عربی کلاسوں تک ان مدرسوں میں تدریس کا عمل جاری ہے، دینی مدرسوں کے اس نیٹ ورک میں یوپی اور بہار سرفہرست ہیں، گجرات میں بھی مدارس کا جال ہے، پھر اس کے بعد مہاراشٹر، ایم پی اور دیگر ریاستوں کا نمبر آتا ہے، اس مضمون میں اس بات سے بحث نہیں کہ کس مدرسے میں کیا پڑھایا جاتا ہے اور کس مدرسے کا معیار کیا ہے؟ یا پھر یہ کہ ان میں سے کتنے Genuine ہیں اور کتنے برائے نام ہیں، تاہم ان کے ناموں کے آگے ''دارالعلوم'' اور ''جامعہ'' جیسی اصطلاحیں دست جنوں کو جیب کی طرف بڑھانے پر ضرور آمادہ کرتی ہیں، کیونکہ ہمارے یہ مدارس روشنی کے مینار ہیں اور مستقبل میں ہماری نسلوں کے دینی، ایمانی، روحانی، تہذیبی، ثقافتی، لسانی اور اخلاقی تحفظ کی ضمانت کے لئے مضبوط قلعے ہیں۔

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ پر اخیر عمر میں جو بات غالب تھی ان میں ایک تحریک پیام انسانیت اور دوسری غلبۂ توحید کے دائرے میں آئندہ نسلوں کی تربیت تھی، یوپی حکومت کی جانب سے ڈرگا وندنا اور وندے ماترم کی پابندی کے خلاف حضرت کا یک نفری جہاد اسی جذبۂ توحید کا پرتو بلیغ تھا، سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۳۳، اکثر حضرت کے ورد زبان رہتی گویا کہ اپنی آخری علالت میں ہر آنے جانے والوں سے پوچھ رہے ہوں، مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ یعنی میرے بعد تم کسے پوجنے لگوگے؟ ظاہر ہے وحدت کا یہ نقطۂ بلیغ طبقۂ علماء اور دینی مدارس کے ذمہ داروں کے علاوہ اور کس کے ذہن میں آسکتا ہے؟

قارئین کے لئے یہ بات اچنبھے کی نہیں ہونی چاہئے کہ دینی مدارس کے قیام کے دوران مسلم اختراعی ذہن نے لڑکیوں کے مدارس بھی آباد کرنے کا سلسلہ شروع کردیا، سب سے پہلا تجربہ کب اور کہاں ہوا، یہ کہنا تو مشکل ہے لیکن اتنا تو ضرور کہا جاسکتا ہے کہ تعلیم نسواں کے فلک شگاف نعرہ بازی کے اس دور میں لڑکیوں کے اقامتی مدارس کو زبردست کامیابی ملی اور اس میں داخلے کے لئے نہ صرف ہندوستان بلکہ جنوبی افریقہ، امریکہ، انگلستان، کناڈا، فرانس، جرمنی اور دیگر کئی یورپی ملکوں کے دین دار گھرانوں کے والدین اونچی فیس دے کر اپنی صاحبزادیوں کی اعلیٰ



دینی تعلیم کے لئے کوشاں نظر آنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے لڑکیوں کے معیاری اور غیر معیاری دینی مدارس کا ملک میں جال سا پھیلتا چلا گیا اور عالمات کی ایک نئی پود نے جنم لیا۔

ہمارے دینی مدارس کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ ان کا کوئی مستقل قومی سروے یا جائزہ موجود نہیں ہے، کچھ برسوں پہلے ہمدرد یونیورسٹی والوں نے یہ کوشش کی تھی لیکن وہ کام بھی مزید توجہ چاہتا ہے، یہ کیفیت ملت کے حق میں مفید بھی ہے اور مضر بھی، لیکن ہماری رائے میں صرف دینی مدارس کی ایک رائے شماری ملی سطح پر ضرور ہونی چاہئے تاکہ ہمیں یہ اندازہ ہوسکے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں، لڑکیوں کے لئے اقامتی دینی درس گاہیں کھولنے کا یہ خیال بہت ممکن ہے ہمارے دینی کارکنان کو عصری اسکولوں اور کالجوں میں چلنے والے ہوسٹلوں کو دیکھ کر آیا ہوگا۔

خواتین کے لئے دینی تعلیمی اقامتی درس گاہوں کے قیام کا یہ واقعہ ملت اسلامیہ کے ساتھ پوری اسلامی تاریخ میں پہلی مرتبہ پیش آیا ہے، آٹھویں صدی عیسوی میں جب مسلمانوں نے اندلس (اسپین) فتح کیا تو گویا ان کی تمناؤں کو پر لگ گئے، قرطبہ، غرناطہ، طلیطلہ، الحمراء، اشبیلیہ وغیرہ ان کی توجہ کے مرکز بن گئے، پوری عالمی تاریخ گواہ ہے کہ خلیفہ ہارون رشید (۷۶۶ء تا ۸۰۹ء) نے کرۂ ارض کے جتنے بڑے علاقے پر حکومت کی ہے آج تک کوئی فرد واحد، شہنشاہ، شہنشاہوں کا شہنشاہ اتنے بڑے علاقے پر حکومت نہیں کرسکا ہے، اس کی حکومت تین براعظموں یعنی یورپ، ایشیا اور افریقہ تک پھیلی ہوئی تھی، یہ اور اس کے بعد آنے والے ہسپانوی خلیفہ اسلامی عقائد کے ساتھ ساتھ جدید علوم کے شیفتہ اور نہایت ترقی یافتہ تھے، گویا وہ آج کا یورپ اور امریکہ تھے لیکن حیرت ہوتی ہے کہ پوری اسلامی تاریخ میں ان کے ذریعے خواتین کے لئے قائم کئے گئے کسی مدرسے کا ذکر نہیں ملتا ہے، ان ہی حکمرانوں کے دور میں الرازی، بوعلی سینا، الخوارزمی، ابوالقاسم زہراوی، ابن البیطار، جابر بن حیان، الکندی، علی عباس، البیرونی، الفارابی، ابن الہیثم، اکبر ارزانی، عیسیٰ بن حکیم، علی بن طبری، ابن رشد، علی بن عیسیٰ، الشریف الادریسی اور اسی طرح کے سینکڑوں مایہ ناز سائنس داں اور عصری و دینی علوم کے ماہر پیدا ہوئے، ابوبکر محمد بن زکریا رازی اور ابوالقاسم زہراوی نے تو باقاعدہ اسپتال قائم کئے، آج کے دور میں آپ جو Hospital Management کا کورس دیکھ رہے ہیں اور جونیئر شپ اور عملی خدمات Inturns Ship کی جو پابندیاں دیکھ رہے ہیں اس کی ابتدا دنیا میں سب سے پہلے

ابوبکر محمد بن زکریا رازی نے کی ہے، بنوامیہ کے بعد اسپتالوں کا باقاعدہ آغاز اسی ماہر طب و ادویہ کا مرہون منت ہے، مسلمانوں کی اس ترقی کو پڑھ کر مشہور امریکی فلسفی برٹرینڈ رسل کو یہ کہنے پر مجبور ہونا پڑا کہ "آٹھویں تا تیرھویں صدی عیسوی کے دوران جب سارا یورپ جہالت کی تاریکی میں غرق تھا، عین ان دنوں مسلمان علم و اخلاق کی مشعل روشن کئے ہوئے تھے"، حیرت ہوتی ہے کہ اتنے روشن خیال لوگوں کے دل میں بھی لڑکیوں کے لئے کوئی مدرسہ قائم کرنے کا خیال پیدا نہیں ہوا، افراط و تفریط کے اس دور میں لڑکیوں کے لئے مدرسوں کی داغ بیل ڈالنے والے یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں۔

دور رسالتؐ کے بعد بھی متعدد خواتین بڑی فقیہہ، محدثہ، مفتیہ اور عالمہ گذری ہیں، حضرت عائشہؓ سے جتنی احادیث مروی ہیں اتنی کسی دوسری صحابیہ یا ام المومنین سے مروی نہیں، حضرت عائشہؓ حضور اکرمؐ کی وفات کے بعد بھی اپنی اخیر عمر تک مردوں اور عورتوں کو برابر تعلیم دیتی رہیں، ظاہر ہے کہ صحابیات مردوں کے ساتھ درس گاہ نبوی میں حاضر نہیں ہوسکتی تھیں، بعض مرتبہ حضورؐ خود ان کے خصوصی اجتماع میں تشریف لے جا کر تعلیم و تلقین فرمایا کرتے تھے، حضرت عائشہؓ اور ام سلمہؓ یہ دونوں امہات المومنین حضورؐ سے راست مسائل معلوم کرتیں اور خواتین میں اس کی تعلیم فرماتیں، حاضر باش صحابہ اپنی بیویوں کو تعلیم دیتے اور وہ دوسری خواتین میں اس معلومات کو عام کرتیں، حضور اکرمؐ کے وصال کے بعد جب دور صحابہ، تابعین اور تبع تابعین میں علم اور عالموں کے اٹھ جانے کا خدشہ محسوس ہوا تب بھی لڑکیوں کے لئے کسی مدرسے اور درس گاہ کے قیام کا خیال ان نفوس قدسیہ کے دل میں نہیں جاگا......تو...... آخر کیا وجہ ہے کہ ہم ہر شہر اور قریے میں لڑکیوں کے لئے درس گاہوں کی تعمیر میں جٹے ہوئے ہیں، اس عمل کے نتیجے میں لامحالہ طور پر ہمارے ذہن میں یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ:

۱۔ کیا اسلامی شریعت میں کسی بالغ خاتون کو بغیر کسی محرم یا شوہر کے غروب آفتاب کے بعد کئی کئی مہینوں تک یا ایک آدھ روز کے لئے ہی سہی گھر سے باہر رہنے کی اجازت ہے؟ جبکہ ہمارا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ عورت کے لئے سب سے محفوظ جگہ اس کے شوہر کا گھر ہے، اس کے بعد اس کے باپ کا گھر اور سب سے غیر محفوظ جگہ اس کے شادی شدہ بھائی کا گھر ہے۔

۲۔ کیا ان دینی مدارس میں لڑکیوں کو بچوں کی پرورش کی سائنس اور امور خانہ داری کی ٹیکنالوجی سے واقف کرایا جاتا ہے؟ عورت کا Career غیر مردوں کے ساتھ دفاتر میں کام



کرنے یا ان کے لئے ہوٹلوں کے کمرے سجانے اور بستر صاف کرنے میں نہیں بلکہ اپنے پیٹ کی اولاد کو مستقبل کے لئے نئی نسل بنا کر ابھارنے میں ہے۔

۳۔ کیا مدارس میں پڑھنے والی مستطیع طالبات کو ان کے گھر جیسا آرام اور ماں باپ جیسا پیار مہیا کیا جاتا ہے؟۔

۴۔ کیا ان مدارس میں لڑکیوں کو مچل جانے اور ضد کرنے اور فرمائش کرنے کے مواقع اور ان کی پابجائی میسر ہے؟ یاد رہے کہ بیٹیوں کی فرمائشیں اور ضرورتیں بیٹوں سے زیادہ ہوتی ہیں!۔

۵۔ کیا ان دینی مدارس میں پردے اور نظافت کا پورا پورا انتظام ہوتا ہے؟ جب کہ شریعت میں آواز پر بھی پردے کی شرط لازم قرار دی گئی ہے!۔

۶۔ کیا ان مدرسوں میں رشتے، ناطوں، جائز اور مشروط رسوم و رواج، تیج تیوہاروں، خاندانی اور عائلی ضرورتوں، روایتوں اور عادتوں کا پاس و لحاظ رکھا جاتا ہے؟ جب کہ عورت کا خمیر رشتے، ناطے کی عورتوں، خاندانی روایات کی پاسداری کرنے والی بڑی بوڑھیوں میں اٹھ بیٹھ کر بنتا ہے۔

۷۔ کیا ان مدارس کے پاس لڑکیوں کے مدارس میں اٹھنے والے روز افزوں نئے مسائل اور بڑھتی عمر کے لحاظ سے پیدا شدہ پیچیدگیوں کی شکایات کا کوئی ریکارڈ اور ان کے حل کا کوئی روزنامچہ (Cumulative Record) میسر ہے؟۔

۸۔ موجودہ فرقہ وارانہ حالات میں بعض مرتبہ شہر سے دور، سنسان اور اوبڑ کھابڑ جگہوں پر ان مدارس کا قیام کیا پوری ملت اسلامیہ کے سامنے ان لڑکیوں کے تحفظ کے تعلق سے کوئی سوال نہیں کھڑا کرتا؟۔

۹۔ اقامتی درس گاہوں سے فراغت کے بعد ان عالمات نے کون سا کارنامہ انجام دیا ہے؟ کتنی مصنفہ، معلمہ، داعیہ، فقیہہ، مجتہدہ، محدثہ اور عالمہ بنی ہیں؟ اور اگر بنی بھی ہیں تو ان کا کیا مقام و معیار ہے اور ملت نے ان سے کتنا رجوع کیا ہے؟۔

۱۰۔ تجربہ اور اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ ان فارغات کی اکثریت نکاح کے بعد اپنے شوہر اور سسرال والوں سے نباہ کرنے میں ناکام رہی ہے! کیا ان درس گاہوں کے ذمہ داران کے پاس اس کی تردید میں اعداد و شمار اور ثبوت موجود ہیں؟۔

۱۱۔ بنات کے لئے درس گاہیں چلانے والوں کی اپنے مسائل کے حل، نصاب اور تدریس کی ضرورتوں، اساتذہ اور معلمات کی تدریسی اور اخلاقی معیار کی جانچ پرکھ، مالیات کی فراہمی، انتظام و انصرام (Administration)، درسی و مطالعہ جاتی کتب کی تدوین و ترتیب، منظوری، پھیر بدل، جدید علوم، تعلیمی تجربات، موجودہ عالمی نسوانی ضرورتوں اور ان تک اسلامی تعلیمات پہنچانے کی کوششوں اور جائزوں کے تعلق سے کیا ان کی اپنی کوئی تنظیم یا مشاورتی بورڈ یا اسی قبیل کا کوئی مرکزی ادارہ (Nodle Agency) ملک یا بیرون ملک میں موجود ہے؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ لڑکیوں کو ملت نے خودساختہ ماہرین تعلیم اور خود رائے منتظمین کے حوالے کر رکھا ہے! اس کے جواز اور عدم جواز کا فیصلہ قارئین خود فرمالیں۔

۱۲۔ کل کو ملک میں خدانخواستہ کوئی ایمرجنسی پیدا ہوجائے اور اپنی بچیوں کو لینے اس شہر میں والدین کا پہنچنا بھی مشکل ہوجائے، ایسی صورت حال میں مدرسہ کیا کارنامہ انجام دے سکتا ہے کہ لڑکیاں محفوظ بھی رہیں اور اپنے گھروں تک بھی پہنچ جائیں؟

۱۳۔ مدرسے میں تعلیم کا یہ عرصہ بچیوں کے لئے عین وہ عرصہ ہوتا ہے جب وہ اپنے خاندان میں رہ کر والدین اور اہل خانہ کی خدمت کا فریضہ انجام دے سکیں اور اس کی تربیت حاصل کرسکیں، اس کمی کو پورا کرنے کے لئے مدرسے والوں کے پاس کیا پروگرام ہے؟

ضروری نہیں کہ ہمارے یہ خیالات ہر ایک کے لئے قابل قبول ہوں علاوہ ازیں انہیں استناد کا بھی کوئی درجہ حاصل نہیں ہے! ہم رجوع کرنے کے لئے تیار ہیں، اس مضمون کو سپرد قلم کرنے کا ایک سب سے بڑا مقصد دراصل اس ضمن میں ایک ملک گیر بحث کا آغاز کرنا ہے، ارباب حل وعقد کی آراء کا استقبال ہمارا فریضہ ہے، عصری تعلیم گاہوں میں طالبات کی بے راہ روی آئے دن اخباروں کی زینت بنتی رہتی ہے، یاد رہے کہ ہم لڑکیوں کی دینی تعلیم کے مخالف نہیں بلکہ اقامتی درس گاہوں میں رہ کر تعلیم حاصل کرنے کے خلاف ہیں، اگر اس کا کوئی شرعی جواز ہم تک پہنچ جائے تو ہم رجوع کرنے کے لئے تیار ہیں، محض عصری تعلیم گاہوں کی نقالی ہمیں متاثر نہیں کرسکتی۔

آئے ہے بے کسئ شوق پہ رونا غالب کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد؟

☆☆☆☆



# شاہ سلطان ثانی

از جناب علیم صبا نویدی ☆

آرکاٹ کے مشاہیر شعراء اور نثر نگاروں میں شاہ سلطان ثانی غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں، ان کی جائے پیدائش کے بارے میں محققین میں اختلاف پایا جاتا ہے، ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور مولوی نصیر الدین ہاشمی نے انہیں گول کنڈہ کا باشندہ بتایا ہے، ڈاکٹر زور لکھتے ہیں:۔

"سلطان اس دور (قطب شاہی) کے ایک صوفی شاعر تھے جن کا کلیات اردو میں موجود ہے" (۱)۔

مولوی نصیر الدین ہاشمی ڈاکٹر زور کی مذکورہ رائے سے اتفاق کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:۔

"سلطان بھی اس دور (قطب شاہی) کا شاعر ہے دیگر شعراء کی طرح ہم اس کے نام سے واقف نہیں ہیں" (۲)۔

مولوی افسر صدیقی امروہوی اور سخاوت مرزا نے شاہ سلطان کو عادل شاہی دور کے شاعروں میں شمار کیا ہے، افسر صدیقی اطلاع دیتے ہیں:۔

"سلطان کا کیا نام تھا اور کہاں کا رہنے والا تھا اور کس عہد میں تھا؟ ان سوالوں کا جواب نہ کسی تاریخ سے ملتا ہے اور نہ کسی تذکرے سے...... البتہ اس کی زبان سے صرف یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دکن کا باشندہ اور عادل شاہی دور کا شاعر ہے" (۳)۔

---

☆ ۲۶/امیر النساء بیگم اسٹریٹ، چنئی ۲۔

(۱) ڈاکٹر زور، دکنی ادب کی تاریخ، ص ۷۳ (۲) نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو، ص ۱۱۶ (۳) افسر صدیقی، مخطوطات انجمن ترقی اردو، کراچی، جلد چہارم ص ۱۷۵

مولوی سخاوت مرزا نے شاہ سلطان کے واقعاتِ حیات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"ہمارا یہ خیال ہے کہ شاہ صاحب (شاہ سلطان) ایک وسیع المشرب بیجاپوری بزرگ تھے اور ان کے تعلقات نہ صرف بیجاپور بلکہ احمد نگر اور گول کنڈہ سے بھی تھے"(۱)۔

راقم الحروف نے شاہ سلطان کے وطن، تاریخ پیدائش اور ان کے سلسلۂ نسب کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"آپ بہ مقام آرکاٹ ۱۰۱۸ھ بمطابق ۱۶۰۹ء میں پیدا ہوئے، آپ کے والد ماجد سید فخر الدین سلطان حسینی تھے اور آپ کا سلسلۂ نسب حضرت بندہ نواز گیسو دراز سے ملتا ہے"(۲)۔

ڈاکٹر رضیہ صدیقی نے اپنے تحقیقی مقالے "دیوان سلطان کی تنقیدی تدوین" میں سید اکبر حسینی سجادہ نشین حضرت شاہ سلطان ثانی کے توسط سے شاہ سلطان کے بارے میں یہ اطلاع دی ہے کہ:۔

"شاہ سلطان ثانی کا تعلق سادات حسینی سے ہے، آپ کے والد کا نام سید فخر سلطان حسینی تھا...... آپ روم کے کسی علاقے کے حکمران تھے، جب آپ پر جذبۂ الٰہی طاری ہوا تو اپنی امامت کو خیر باد کہہ کر اپنے بڑے صاحب زادے غالب حسینی کے سر پر خاندانی تاج رکھتے ہوئے فرمایا کہ "اب تم ثانی سلطان ہو ہم راہِ فخر اختیار کرتے ہیں...... یہ سن کر سید سلطان غالب حسینی نے کہا جس چیز کو آپ ٹھکرا کر چلے ہیں مجھے وہ کیوں کر پسند ہو سکتی ہے، میں بھی آپ کے ہم راہ چلتا ہوں، اس وقت فخر سلطان کے ساتھ ان کے اور دو صاحب زادے سید کلاں اور سید اکبر بھی روانہ ہوگئے، اولاً یہ لوگ بندر سورت میں داخل ہوئے اور مختلف مقامات یعنی گجرات، بیجاپور اور گلبرگہ سے ہوتے ہوئے بیدر پہنچے، چوں کہ آپ پر جذبۂ الٰہی طاری تھا، تلاش پیر کی ضرورت محسوس ہوئی، ان دنوں بیدر میں حضرت شاہ محمد اکبر حسینی کا

(۱) مولوی سخاوت مرزا، اردو ادب، (سہ ماہی) شمارہ نمبر۱، ۱۹۶۸ء، (۲) علیم صبا نویدی، تمل ناڈو کے صاحب تصنیف علماء، مطبوعہ ۱۹۹۶ء۔



چرچا تھا، جو حضرت بندہ نواز کی اولاد سے ہیں، فخر سلطان آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، بیعت سے مشرف ہو کر شیخ کے بتائے ہوئے شغل میں مصروف رہے، بعد تکمیلِ سلوک خلافت سے مشرف ہوئے وہاں سے علاقہ مدراس (Vangoor) چلے آئے اور قصبۂ وانگور میں اقامت کی، فخر سلطان نے قصبۂ وانگور میں خس پوش جھونپڑیاں بنائیں اور اپنے لڑکوں کے ساتھ مقیم رہے، اس کے بعد وانگور سے بھی خاندان وڈی گراپونڈی (Vadigra poondi) پہنچ کر وہیں سکونت پذیر ہوگیا، اسی مقام پر آپ نے اپنے بڑے صاحب زادے شاہ سلطان کو بیعت و خلافت سے مشرف کیا، سید فخر سلطان کی تدفین کے بعد حضرت شاہ سلطان نے مسندِ ارشاد پر جلوہ افروز ہو کر رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری فرمایا، مرتضیٰ گیان اور جمال علی شاہ کو بعد تکمیل سلوک خلافت بخشی، سید اکبر حسینی صاحب سجادہ نشین کے ہاں جو حالات ملتے ہیں اس میں شاہ عالم المتخلص شغلی کو شاہ سلطان کا مرید اور اچھا شاعر بتایا گیا ہے"(۱)۔

ڈاکٹر رضیہ صدیقی نے فخر سلطان کے مرشد کی وفات کا سن ۱۶۲۱ء بتایا ہے اور یہ اطلاع بھی دی ہے کہ اس وقت شاہ سلطان ثانی کی عمر ۱۳ برس کی تھی اس اعتبار سے شاہ سلطان کی تاریخ پیدائش راقم الحروف کے دیے ہوئے سال پیدائش کے مطابق ۱۶۰۹ء قرار پاتی ہے اور یہی تاریخ قرین قیاس اور زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

ڈاکٹر رضیہ صدیقی کی تحقیق کے مطابق شاہ سلطان نے ۷۹ سال کی عمر میں ۱۰ رمضان المبارک ۱۶۸۵ء کو وفات پائی، راقم الحروف نے بھی شاہ سلطان کی وفات کا سال یہی بتایا ہے۔

شاہ سلطان ثانی کا مزار وڈی گراپونڈی میں ان کے والد اور مرشد فخر سلطان حسینی کے مزار سے متصل ہے (۲)۔

مذکورہ بالا شواہد کی روشنی میں یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ شاہ سلطان حسینی بنیادی طور پر

(۱) ڈاکٹر رضیہ صدیقی "دیوان سلطان کی تنقیدی تدوین" غیر مطبوعہ ص ۲۲-۲۷، مذکورہ مقالے کا تفصیلی ذکر "ڈاکٹر محمد علی اثر کی کتاب "دکنی غزل کی نشو و نما" میں بھی موجود ہے۔ (۲) ایضاً غیر مطبوعہ، ص ۲۷

ٹمل ناڈو کے مختلف علاقوں میں زیادہ عرصے تک مقیم رہے، یہاں تک کہ وہ اسی علاقے کی خاک کا پیوند بنے، یہ ضرور ہے کہ بچپن میں اپنے والد کے ہم راہ انہوں نے گجرات، بیدر، احمد آباد، گول کنڈہ اور بیجاپور کی سیاحت کی۔

شاہ سلطان ثانی کی شاعرانہ عظمت کا دار و مدار ان کے ضخیم کلیات پر ہے، جس میں ان کی قادر الکلامی اور بے پناہ شعری صلاحیتوں کا اظہار ہوا ہے لیکن وہ قدیم اردو کے اہم ترین نثر نگار بھی تھے، انہوں نے ''زنجیرہ'' اور ''دُرالاسرار'' کے نام سے دو نثری تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں، یہ دونوں تصانیف ابھی تک زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہو پائیں، جہاں تک شاہ سلطان کے کلیات کا تعلق ہے محمد قلی کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کا دیوان پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے، شاہ سلطان کے دیوان میں تقریباً ساڑھے تین ہزار اشعار موجود ہیں، دوسرے الفاظ میں غزلوں کی تعداد اور تنوع کے اعتبار سے محمد قلی کے بعد سلطان دکنی اردو کا سب سے پُرگو شاعر قرار پاتا ہے۔

شاہ سلطان نے جب شعور کی آنکھ کھولی تو اس وقت دکن کی فضاؤں میں محمد قلی کے علاوہ غواصی، عبداللہ قطب شاہ، حسن شوقی، نصرتی، شاہی اور ہاشمی بیجاپوری کے نغمے گونج رہے تھے، شاہ سلطان کی غزلوں کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے مذکورہ بالا شعراء کے کلام کا گہرائی اور گیرائی کے ساتھ مطالعہ کیا اس لئے ان کے کلام میں دکنی شاعری کی تمام اعلیٰ اقدار اور توانا روایت سے اثر پذیری کا پتہ چلتا ہے۔

شاہ سلطان کو نہ صرف دکنی زبان پر مہارت حاصل تھی بلکہ وہ عربی فارسی زبان پر غیر معمولی عبور رکھتے تھے، ان کی غزلوں میں ایک طرف عربی کے بے شمار الفاظ بڑی روانی کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں تو دوسری طرف فارسی کے اہم متغزلین سے مستفید ہونے کا بھی پتہ چلتا ہے، دکن کے وہ اولین غزل گو شاعر ہیں جن کے کلام کی جنوبی ہند کے متعدد علاقوں میں وسیع پیمانے پر پذیرائی ہوئی، جس طرح بعد کے زمانے میں قربی ویلوری اور ولی اورنگ آبادی کی غزلوں کو ہندوستان گیر شہرت حاصل ہوئی بالکل اسی طرح شاہ سلطان کی غزلیں دکن کے مختلف اور متعدد علاقوں میں نہ صرف مقبول ہوئیں بلکہ ان سے استفادہ کرنے کا رجحان عرصہ دراز تک جاری رہا۔



شاہ سلطان کی شعری صلاحیتوں اور ان کے علم و فضل پر روشنی ڈالتے ہوئے مولوی سخاوت مرزا رقم طراز ہیں:-

''شاہ صاحب (شاہ سلطان) بڑے مستغنی الاوصاف تھے، ایسے زمانے میں جب کہ سلطان محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ جیسے دریا دل قدر دان علم و فضل موجود تھے اور ان کے جود و سخا کا سمندر موجیں مار رہا تھا، وجہی، غواصی، افضل اور دیگر شعرائے ایران ان سلاطین کی بحر جود بخشی سے نہال اور رطب اللسان تھے، آپ کے ضخیم دیوان میں کوئی ایسا شعر نہیں ملا جو کسی سلطانِ وقت یا امیر کی شان میں رہا ہو...... محمد قلی قطب شاہ، غواصی، وجہی اور شاہ سلطان اردو زبان کے معمار ہیں، الفاظ کی تراش و خراش، جدت پسندی، تنوع مضامین اور قافیہ پیمائی میں کمال کر دیتے ہیں بلکہ شاہ سلطان تو دو قدم اور آگے بڑھ گئے ہیں'' (۱)۔

نمونۂ کلام

پس بیخودی کے خاخ میں گفتار کون جاگا کہاں    جاں حال دانش ہے نہاں بسیار کون جاگا کہاں

تس ذات کے دریائے عاشق کہتے ڈوبے رہیں    واصل ہوئے حیرت تہاں پرکار کون جاگا کہاں

اسرار کے بازار میں سرکاٹ کو لے بات میں    پھرتے ہیں مجنوں ناو ہاں ہشیار کون جاگا کہاں

تج بال نازک گال پر بلہار ہوں بلہار ہوں    ہور تج ٹھمکتی چال پر بلہار ہوں بلہار ہوں

تج اوس صلونے نین پر، تج آبرو قوسیں پر    ہور میٹھ رسیلے نین پر بلہار ہوں بلہار ہوں

تج حسن کے گلزار پر، تج زلف کے اوس مار پر    ہور نیاز کے عیار پر بلہار ہوں بلہار ہوں

گفتم کہ یک بوسہ بدہ گفتا کہ زمیں مفرد راچہ    گفتم کہ سوزم برہ سوں گفتار کہ ہو کھطو راچہ

گفتم کہ غمگیں ہوں نپٹ اس وقت مج غمخوار ہو    گفتا کہ اس منہ نپٹ میں غم سوں سدا بھر پوراچہ

گفتم کہ تختی وصل پوجکوں بیٹھا سلطان کر    گفتا کہ نہ ہو بے ادب تو زمیں اجا مجو راچہ

(۱) سخاوت مرزا، اردو ادب، سہ ماہی شمارہ ۱۵، ۵-۵۹

عجب طناز ، ہورا چیل ستم گر ترادیدہ جیالنے اجل ہستی فزوں تر ہے ترا دیدہ

کتنے لک تج دوبے ہیں بلا آفت کے طوفاں کا سمندر ہے ترا دیدہ

اے موہن عشق کے سلطان تو تج تاراس کے تو جاں میں دلاور شوخ وصف زن ست کنجر ہے ترا دیدہ

تج مکھ پہ لٹ ہے یوں، جیوں مہ پر ابر پڑیا ہے یا چاند غرب میں جیوں تھوڑا اتر پڑیا ہے

تج خال رخ پو چشمت یا یوں ہے شکرلب دو باز آکے جھپٹے جو زاغ ڈر پڑیا ہے

تج خال اگل اے خوباں یوں ہے خیال رخ مل سلطاں کے صدر پر جیوں خوش سپر پڑیا ہے

سوکا زہر میں سپٹا ہے کنڈل گل ہوں ناگ کے مکھ میں زہر، زہر میں اثر، میں اثر میں ہوں

لذت مٹھا وصال کا ڈھونڈتا ہے جگ ہنوز گانڈے میں رس، ہے رس میں شکر، میں شکر میں ہوں

قائم بقا کے تخت کا سلطاں ہے امیر جو امر ادر کھیا ہے میں اوس کے امر میں ہوں

تو گر آس دنیاں کی بہوت پچھتاوے گا آخر پشیماں ہوے گا دنیا نپٹ خیفت ملامت ہے

خدا آفت بلا میں یوں مومن کوں آزماتا ہے اگن میں زرکوں بہا زرگر جو جیوں بیرن جلاتا ہے

مکھڑا ترا یوں دیکھ پری سار آفتاب ہر صبح آ کھڑا تیرے دربار آفتاب

ہر روز چہرہ مسما پو تجھے دیکھ یر خجل پڑتا ہے جا ستم ستی فی النار آفتاب

ہر روز تجکوں دکھ دے سلطان حسن سن پھرتا ہے تج اوپر تے واپس وار آفتاب

مختصر یہ کہ شاہ سلطان ثانی کی دکنی ادب میں دوہری اہمیت ہے، ایک طرف وہ دکن میں اردو نثر کے اولین معمار ہیں اور حضرت خواجہ بندہ نواز کے خانوادہ سے تعلق رکھنے والے صوفیہ، علما اور نثر نگاروں شاہ محمد اکبر حسینی، شاہ برہان الدین جانم، شاہ امین الدین اعلیٰ اور دوسرے اہلِ علم کی نثر نگاری کے سلسلے کو انہوں نے آگے بڑھایا تو دوسری طرف دکنی غزل کے وہ ایک قد آور شاعر ہیں اور ان کا شمار دبستانِ دکن کے گنے چنے صاحب دیوان شاعروں میں ہوتا ہے، ان کے کلام کے مطالعے سے ایک طرف ان کی مختلف زبانوں پر ماہرانہ قدرت کا پتہ چلتا ہے تو دوسری طرف ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

☆☆☆☆



# معارف کی ڈاک

## صحتِ املا

کاشانۂ ادب سکٹا، دیوراج،

مغربی چمپارن، بہار

۲۰۰۲/۱۱/۲۷ء

مخدوم گرامی قدر، السلام علیکم!

امید ہے آپ بہ ہمہ وجوہ خیریت سے ہوں گے۔

معارف اکتوبر ۲۰۰۲ء میں ترجمان القرآن حضرت مولانا حمید الدین فراہیؒ کی ''القائد الی عیون العقائد'' کے حوالے سے آپ کا مقالہ اسلامی عقائد کے بارے میں ''چند اصولی باتیں'' پسند آیا، یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیئے، مذکورہ شمارے میں آپ نے ''علامہ اقبال اور احمدیت'' پر اس ناچیز کا مضمون اور سرسید احمد خاںؒ پر اس خاکسار کی نظم شائع کی ہے، اس کے لئے سراپا ممنون ہوں۔

مذکورہ مضمون میں صفحہ ۲۸۳ پر ''رموز بے خودی'' کے حوالے سے جو اشعار درج کئے گئے ہیں ان میں آخری شعر کا دوسرا مصرع یوں ہے:۔

''مثل موج از ہم نمی ریزیم ما''

اس مصرع میں ''نمی ریزیم'' کے بہ جائے ''نمی وزیم'' کمپوز ہو گیا ہے س سہو کے علاوہ صحتِ املا سے متعلق بھی چند باتوں کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں:۔

ا۔ مضمون مذکورہ میں جہاں جہاں ''لیے'' اور ''کیے'' کے الفاظ آئے ہیں انہیں ۔ ے''

اور ''کیئے'' کمپوز کیا گیا ہے، حالاں کہ ان الفاظ کا صحیح املا ''لیے'' اور ''کیے'' ہے، جناب رشید حسن خاں صاحب لکھتے ہیں:-

''۔ لیے'' کو اکثر ''لئے'' لکھا جاتا ہے، یہ بالکل غلط لکھاوٹ ہے، صحیح املا ''لیے'' ہوگا، کیوں کہ یہ قاعدہ ہے کہ جب بھی ''ی'' سے پہلے والا حرف مکسور ہوگا لازمی طور پر ''ہمزہ'' نہیں آسکتا، ہمیشہ ''ی'' آئے گی''۔ (اردو املا، ص ۳۹۴)

لفظ ''کیے'' پر بھی یہی قاعدہ جاری ہوگا، چنانچہ ثبوت میں رشید حسن خاں صاحب نے انشا، کے حسب ذیل مصرعے پیش کیے ہیں:-

مے پیے، قشقہ دیے، کعبے میں ناقوس لیے (ایضاً)

خوش ہو، سب اہلِ خرابات نے پابوس کیے (ایضاً)

۲۔ ''دانائے سبل''، ''مولائے کل'' جیسے الفاظ کی ''ے'' پر ''ہمزہ'' کا اضافہ کرکے ''دانائے سبل'' اور ''مولائے کل'' کمپوز کیا گیا ہے، اسی طرح کے الفاظ کے املا پر روشنی ڈالتے ہوئے رشید حسن خاں صاحب لکھتے ہیں:-

''جن لفظوں کے آخر میں الف ہوتا ہے، اضافت کی صورت میں ان کے آگے ''یاے مجہول'' کا اضافہ کیا جائے گا جیسے: دنیاے محبت، ہمزہ کا یہاں بھی کچھ کام نہیں ...... اسی طرح جن لفظوں کے آخر میں واو (معروف یا مجہول) ہوتا ہے، اضافت کی صورت میں ان الفاظ کے ساتھ بھی ''ے'' کا اضافہ کیا جائے گا، ہمزہ یہاں بھی نہیں آئے گا، جیسے: بوے گل، خوش بوے وفا...... وغیرہ'' (ایضاً ص ۴۱۰۔۴۱۱)

جن الفاظ کے آخر میں ''الف'' ہو یا ''واو'' وہ الفاظ مضاف ہوں یا موصوف رشید حسن خاں صاحب کے نزدیک اضافت و توصیف کی علامت ''ے'' پر ہمزہ لکھنا درست نہیں ہے۔ (ایضاً ص ۴۰۶)

غالب کے ایک نایاب خط کے حوالے سے ''دعاے ترقی'' اور ''آقاے نامدار'' جیسے الفاظ میں اضافت و توصیف کی علامت ''ے'' پر ہمزہ نہ لگائے جانے کے سلسلے میں محترمی پروفیسر نذیر صاحب مدظلہ کا نقطۂ نظر بھی ملاحظہ ہو:-



''سید قدرت نقوی صاحب یاے اضافت و توصیف میں ''یا'' پر ''ہمزہ'' لگانا ضروری سمجھتے ہیں، جیسے: دعائے ترقی، آقائے نامدار، یہ صرف سید صاحب کی رائے نہیں بل کہ اکثر حضرات اسی رائے پر کاربند ہیں، راقم کے نزدیک یہ رائے صحیح نہیں معلوم ہوتی، چوں کہ یہ صورت صرف فارسی کے ساتھ مخصوص ہے، اس بنا پر اس سلسلے میں کچھ تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے، پہلوی زبان جس پر فارسی کی بڑی حد تک بنیاد قایم ہے، اس میں اضافت و توصیف کی ایک ہی علامت ''ی'' (یا ''ے'') ہوتی تھی، مثلاً پہلوی ماہ ی فروردیں، زوچ ی خرداد، اس کی جدید شکل فارسی میں یہ ہے: ماہِ فروردیں، زوچِ خرداد لیکن جدید املا میں پہلوی علامت اضافت ''ی'' سب کی سب حذف ہوکر زیر میں تبدیل نہیں ہوئی بل کہ دو صورتوں میں باقی رہی۔

پہلی صورت: حروف علت الف، واو، یا کے بعد کی جیسے: نوای وقت، روی سخن، می خوشگوار، (''میی'' کا املا ''مئ'' بھی ہونے لگا اور جدید دور میں ''مِی'' کی طرح تبدیل ی بہ زیر)۔

دوسری صورت: ہای مختفی یا غیر ملفوظ کے بعد جیسے بادہ ی ناب، نامہ ی دوست، جس کی جدید زیادہ متداول شکل بادۂ ناب اور نامۂ دوست ہے لیکن قدیم فارسی مخطوطات میں ہمزہ کا نام و نشان نہیں ملتا، اسی بنا پر بعض ایرانی دانش ور ہاے مختفی کی صورت میں ہمزہ پر ''ی'' کو ترجیح دیتے ہیں۔

لیکن کسی حالت میں ئے (ے + ہمزہ) فارسی زبان کے طویل عرصے میں بہ طور اضافت مستعمل نہیں رہی ہے، راقم حروف کے نزدیک ''ئے'' کے علامتِ اضافت کے طور پر استعمال نہ کرنے کے تین اسباب ہیں:-

۱۔ فارسی زبان کی یہ علامت ہے جو فارسی کے کسی دور میں اس صورت میں نہیں ملتی۔

۲۔ صوتی اعتبار سے یہ صورت یہ غیر ضروری معلوم ہوتی ہے، نوائی وقت (NAWAI-WAQT) بولتے ہیں اگر نوائے وقت لکھیں گے تو اس کا تلفظ (NAWAY-I-WAQT) ہوگا جو کبھی وزن میں مخل ہوسکتا ہے۔

۳۔ دستوری اعتبار سے بھی ''ئے'' کی صورت غلط قرار پاتی ہے، ''ے'' پر ہمزہ لگانے سے وہ مصدری یا تنکیری صورت کی مثال ہوگی، مثلاً:

آشنائے = کوئی آشنا یا ایک آشنا یا تنکیر یا وحدت، اردو میں اب اس کو یائے مجہول سے لکھتے ہیں لیکن فارسی میں یائے معروف سے آشنائی''۔ (غالب آشفتہ سر، ص ۱۸۱۔۱۸۲)

۳۔ سرسید والی نظم کے ابتدائی تین اشعار میں لفظ '' کہیے'' بہ طور ردیف استعمال کیا گیا ہے، تینوں اشعار میں '' کہیے'' کے بہ جائے '' کہئے'' کمپوز کیا گیا ہے، رشید حسن خاں صاحب نے لکھا ہے کہ تعظیمی افعال میں ''ی'' کی جگہ پر ہمزہ کبھی نہیں آئے گا۔ (اردو املا، ص ۳۹۴)

مذکورہ معروضات کا مقصد یہ ہے کہ معارف جیسے علمی و تحقیقی رسالے کے کاتب یا کمپوزر کو املا کی صحت کا پورا لحاظ رکھنا چاہیے، یہاں ایک بات اور عرض کردوں کہ ص ۲۸۶ پر مراجع میں ۳۴ نمبر کے تحت تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے حوالے میں ص ۱۹۳، ۱۹۴ و ۱۹۵ کا اندراج چھوٹ گیا ہے، اس سہو کا تعلق اس ناچیز سے ہے، کمپوزر سے نہیں۔

نومبر ۲۰۰۲ء کے معارف کے مندرجات اچھے ہیں، ''علامہ شبلی کی عظمت و جامعیت'' کے عنوان سے آپ کا مقالہ بہت اہم ہے، شذرات میں آپ نے قرآن مجید میں ترمیم و تنسیخ کے مطالبے کو مسترد کرتے ہوئے بہ جا تحریر فرمایا ہے کہ:۔

'' قرآن مجید کوئی قصہ کہانی یا افسانہ اور اساطیری داستان نہیں ہے کہ جب جی چاہا اس میں اپنی مرضی سے گھٹا بڑھا اور حذف و اضافہ کر لیا یا سرکشی اور عناد سے اس میں رد و بدل اور کمی و بیشی کر لی ......''۔

جو لوگ قرآن مجید میں ترمیم و تنسیخ کا مطالبہ کر رہے ہیں وہ اپنے ہی دھرم کی طرح مذہب اسلام کو بھی ایک تہذیب یا سنسکرتی تصور کرتے ہیں کہ جب چاہا اپنی مرضی سے کچھ گھٹا بڑھا لیا، اسلام تو '' قرآن مجید'' کی شکل میں ایک منظم دستور حیات رکھتا ہے جو بلا تفریق زمان و مکان ہر دور کے انسانوں کے لیے مشعل ہدایت ہے، جارج برنارڈ شا لکھتا ہے:۔

''میں نے ہمیشہ پیغمبر اسلام (ﷺ) کے دین کو عزت، عظمت اور احترام کی نگاہ سے دیکھا ہے، دین اسلام میں ایک بہت بڑی (روحانی) قوت ہے، اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جو دنیا کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق ہر دور اور ہر زمانہ کی رہنمائی کی اہلیت رکھتا ہے''۔ (اخبار الجماعت، کراچی خاص نمبر، جولائی ۱۹۶۵ء ص ۵)



اگر غیر مسلم دانش ور، جارج برنارڈ شا کی طرح تعصب سے بالاتر ہو کر قرآن شریف اور اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کریں تو ان پر بھی یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ قرآن شریف واقعتا آسمانی کتاب ہے اور اس میں ترمیم و تنسیخ کی کوئی گنجائش نہیں۔

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی کی نظم ''صدای کشتگاں'' کے سوز و گداز نے دیر تک آنکھوں کو پُرنم رکھا، نعمانی صاحب نے اس نظم میں فرقہ وارانہ فسادات کے مظالم کی داستان بڑی خوبی سے بیان کی ہے نظم کے آخری شعر:۔

'' ای خدای اہل ایماں تا بہ کے      ما بہ دست کافراں کشتہ شویم ''

کا تو جواب نہیں، خدا جانے کتنے صد ہزار انجم کے خون کے بعد اسلامی دنیا میں امن و سکون کی ''سحر'' نمودار ہوگی۔

''اشکہائے غم'' کی اشاعت پر بھی تہہ دل سے شکر گزار ہوں، اس نظم کے اس شعر:۔

''وہ جس نے اہلِ علم کے قلب و دماغ میں      بحث و نظر کے لعل و جواہر پرو گیا''

میں مجھ سے بہت بڑی چوک ہوگئی ہے، دوسرے مصرع میں ''پرو گیا''، فعل مرکب ہے، اس میں ''پرونا'' متعدی ہے لیکن ''گیا''، فعل امدادی لازم ہے، گرامر کی رو سے مرکب افعال میں اگر اصل فعل متعدی ہو اور امدادی فعل لازم۔ تو اصل فعل متعدی بھی لازم ہو جائے گا، اس طرح ''پرو گیا''، فعل لازم ہوا، لہذا پہلے مصرع میں علامت فاعل ''نے'' کا استعمال درست نہیں، ڈاکٹر مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:۔

''افعال مرکب تاکیدی میں جب امدادی فعل لازم ہو، خواہ اصل فعل، متعدی کیوں نہ ہو، مرکب فعل کی صورت زمانہ تمام میں لازم کی سی ہوگی اور فاعل کے ساتھ ''نے'' استعمال نہ ہوگا، جیسے: اس نے مٹھائی کھائی، لیکن وہ مٹھائی کھا گیا یا کھا چکا، افعال امدادی لازم ہیں، اس لیے باوجودے کہ اصل فعل متعدی ہے مگر فاعل کے ساتھ ''نے'' استعمال نہیں ہوا''۔ (اردو قواعد، ص ۲۶۹)

مذکورہ چوک پر میں نادم ہوں، اب اس شعر کو میں نے یوں کر دیا ہے:۔

ارباب علم و اہل نظر کے دماغ میں ''بحث و نظر'' کے لعل و جواہر پرو گیا

والسلام

نیازمند۔ وارثؔ ریاضی

**معارف:** فاضل مکتوب نگار نے املا کی صحت کی جانب بڑے مدلل انداز میں توجہ دلائی ہے، اس کے لئے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

اردو املا کا انتشار دور کرنے کے لئے پہلے پروفیسر عبدالستار صدیقی مرحوم سابق صدر شعبۂ عربی الہ آباد یونیورسٹی نے بڑے عالمانہ مضامین لکھے، ان کے بعد پروفیسر گوپی چند نارنگ اور جناب رشید حسن خاں نے اس سلسلے کو آگے بڑھایا، جناب رشید حسن خاں کی تصنیف ''اردو املا'' بڑی مستند و محققانہ کتاب ہے، لیکن نہایت افسوس ہے کہ اس کے بعد بھی املا میں یکسانیت نہیں پیدا ہوسکی، جس کی ضرورت یقیناً مسلم ہے۔

معارف اور دارالمصنفین کی کتابوں میں قدیم املا کا چلن ہے مگر راقم کی عین خواہش ہے کہ گوپی چند نارنگ اور رشید حسن خاں صاحب کی سفارشات اور تجویزیں قبول کرکے نئے املا کا رواج عام ہو، مکتوب نگار نے جن لفظوں پر گفتگو کی ہے ان کو اور بعض دوسرے لفظوں کو راقم خاں صاحب کی سفارش کے مطابق ہی لکھنے کی کوشش کرتا ہے تاہم التزام و اہتمام نہیں ہو پاتا، علاوہ ازیں مضمون نگار، کاتب اور کمپوزر بھی پرانے ڈھرے پر چلنے کے عادی ہیں، تاہم یہ کوتاہی ہے۔

''ض''

## ایک ضروری تصحیح

۵۳، ہارون نگر، فرسٹ سیکٹر،

پھلواری شریف، پٹنہ

۲۰۰۲/۱۱/۱۹ء

مکرمی جناب مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہٗ



امید کہ آپ بخیر ہوں گے۔

موقر مجلّہ ''معارف'' بابت نومبر ۲۰۰۲ء موصول ہوا، اس میں میرا مضمون ''کلیات اقبال'' میں انبیاء اور صحابہؓ پر اشعار کے اشاریے شریک اشاعت ہے۔

غلطی سے اس مضمون میں نبیوں میں حضرت آدم علیہ السلام پر شعر کا اشاریہ دینا چھوٹ گیا ہے، آپؑ پر ''کلیات اقبال'' میں صرف ایک ہی شعر ''بال جبریل'' کی نظم ''جبریل و ابلیس'' میں ہے، اس طرح انبیائے کرام پر اشعار کی تعداد گوشوارہ میں ۱۲۹ ہوگی۔

براہ کرم اس خط کو بطور تصحیح ''معارف'' کے اگلے شمارے میں شائع کردیں۔

دعاؤں طالب

خاکسار

محمد بدیع الزماں

## بعض فروگزاشتیں

۱۱۸/۴۔ لوکو کالونی، (نئی آبادی) علی گڑھ۔

۲۰۰۲/۱۱/۲۵ء

کرم فرمائے دیرینہ زادت عنایتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

نومبر ۲۰۰۲ء کا معارف موصول ہوکر موجب تشکر ہوا۔

تشکر مزید، برائے اینکہ صفحہ ۳۹۵ پر ایک سال قبل والے اشعار (شاید واقعات گجرات کی سال گرہ کی یادگار کے طور پر) مذکور شمارے میں شائع ہوئے، دو تین مصرعوں میں کاتب سے تسامح ہوگیا ہے:۔

۱۔ شعر نمبر ۱۳ کے پہلے مصرعے کے آخر میں ''نگر'' کی جگہ ''نگہ'' بن گیا ہے۔

۲۔ شعر نمبر ۱۷ کے دوسرے مصرعے میں ''تسبیح خوان'' تھا جو ''تسبیح خان'' ہوگیا ہے۔

۳۔ شعر نمبر ۱۸ کے دوسرے مصرعے میں ''آب ونان'' کے درمیان سے ''و'' غائب ہے۔
اگر مناسب سمجھیے تو آئندہ شمارے میں ان تینوں مصرعوں کی تصحیح شائع فرما کر ممنون فرمائیے۔

طالب دعا

رئیس احمد نعمانی

## نومبر کا معارف

کرلا، ممبئی

۲۳ر نومبر ۲۰۰۲ء

گرامی قدر محترم ضیاء الدین اصلاحی صاحب،

سلام مسنون

امید ہے کہ مزاج گرامی مع الخیر ہوں گے۔

آپ کی خیریت شذرات سے ملتی رہتی ہے، نومبر کے شذرات میں قرآن سے متعلق آپ کے فکر انگیز فرمودات سے مستفید ہوا پھر مولانا شبلی کی جامعیت پر آپ کا مقالہ بہت پسند آیا، ڈاکٹر رئیس نعمانی صاحب کی کاوش ''صدای کشتگان'' بے حد پسند آئی پھر ادبیات میں وسیم البارى صاحب مرحوم اور اقبال کی غزلیں بھی پسند آئیں۔

ادھر ایک ماہ وطن میں رہا ۱۴ر نومبر کو واپسی ہوئی، میری اہلیہ کی طبیعت ادھر کئی ماہ سے کافی خراب چل رہی ہے، وطن سے واپسی کے بعد دوسرے دن سے زیادہ خراب ہوگئی جس کی وجہ سے بڑا ذہنی انتشار ہے، دعا کیجئے کہ ان کو جلد صحت کاملہ عطا ہو، آمین۔

والسلام

خورشید



# ادبیات

## دوغزلہ

### غزل (۱)

از پروفیسر محمد ولی الحق انصاری☆

چمن چمن شگفتہ گل اگر بہ مرغزار ہا　　زمن مگو، کہ گشتہ ام اسیر دست خار ہا

برای من پیام عیش نیست در بہار ہا　　مرا، کہ غم نصیب ام، ازین ہمہ چہ کار ہا

امید در ہجوم یاس رونمودہ بار ہا　　شگفتہ غنچہ ہای تر میان خارزار ہا

بسازِ غم سرودہ ام چہ نغمہ ہای سرمدی!　　ہنوز نقلِ آن کنند در چمن ہزار ہا

نمازِ عشق را وضو ز آتش است نی ز آب　　برای غسل وشوی دل روم بہ شعلہ زار ہا

بہ شکل اشک گرم خون دل روانست از دو چشم　　زکوہ غم فتادہ بر زمین آبشار ہا

بروی منعمانِ دون کسی کہ گشتہ سرنگوں　　وقار را فروختہ برای افتخار ہا

فرو نکرد مرگ ہم سرِ سرانِ ہوشمند　　سر بلند شان بلند تر شدہ بہ دار ہا

جدا شدند دستہا ز جسم ہای شان مگر　　ز دستہای شان جدا نہ گشتہ ذو الفقار ہا

ز پشت اسپ بر فرازِ دار بردہ دشمنان　　مگر نہ بر زمین رسید پای شہسوار ہا

گمان مبر کہ دادہ جان، ہنوز اند پیش ما　　عروس عمرِ جاوداں گرفتہ در کنار ہا

بہ قلب ما ہنوز زندہ اند بعد مرگ شان　　چہ شد اگر نیافتند جای در مزار ہا

بُدند سرفراز و بعد سرفراز تر شدند　　بساختند چون زکلہ ہای شان منار ہا

---

☆ ۲۷ر فرنگی محل، لکھنؤ۔ ۳

شوند کشتگان حق چراغ راہ دیگران　　بدون دست و پای و مغزمی کنند کارہا
ولی ببین کہ آمد است منفعل بہ نعش تو　　بروی زرد کیست این میان سوگوارہا

## غزل (۲)

زجور یک بہ دیگری نتیجہ کارزارہا　　زاتصال سنگ و تیشہ برجہد شرارہا
شہا بہ چنگ داشتہ زمیں چو چشمہ سازہا　　شدند پست برزمین بہ شکل آبشارہا
کدام ملک ہست ایں کہ جای نورزندگی　　اجل فگندہ سایہ اش بہ شہرہا ، دیارہا
بہ ہرنفس بہ ہرقدم بہ ہرکسی ست خوف جان　　بسوی قتل گاہ می روند رہگذارہا
کدام شہرہست این کہ بت گران تندخو　　زنوک خنجر ستم کنند شاہکارہا
پیالہ ہابدست شان، صلیب ہابہ پشت شان　　بہ مقتل اہل حق روند برکشیدہ بارہا
قدم منہ بخاک این زمین کہ ذرہ ہای آن　　بُدند استخوانہای جسم شہریارہا
کراست قصراین کہ بہرحسن وزیب وزینتش　　زخون بے کسان کشند نقش ہا نگارہا
صدای حق مکن بلند اگرعزیز ہست جان　　کہ نصب اند جابجا درین حصار دارہا
نہان ست زیر ہر قبا بہ زہر شستہ خنجری　　بہ ہرد راز آستین نہفتہ اندمارہا
کراست خانہ شکستہ ایں کہ چند بی نوا　　بہ فرش خاک آن نشستہ مثل خاکسارہا
نہادہ نعش نوجواں، کساں نشستہ گرد آن　　زفرط رنج نوحہ خوان میان غم گسارہا
یکیست دخت خوبرو دریدہ چہرہ، کندہ مو　　روان زہرد و چشم او زاشک جویبارہا
ستم قرین بی کسی ! بہ بین تضاد زندگی　　ہجوم درد تو امانست بانشاط کارہا
سرود ہای سرمدی دگر مجوی از ولی　　خموش گشت ساز دل، شکستہ شد چو تارہا



# مطبوعات جدیدہ

**سرسید اور علوم اسلامیہ،** مرتبہ پروفیسر محمد یلیین مظہر صدیقی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۳۱۷، قیمت ۱۵۰ روپے، پتہ ادارہ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

سرسید علیہ الرحمہ کے مذہبی و سیاسی افکار و اعتقادات کا تجزیہ ان کی زندگی سے اب تک جاری ہے، زیر نظر مجموعۂ مقالات میں علوم اسلامیہ سے سرسید کے تعلق و تاثر کو اس احساس کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ سرسید کی جدت پسندی کبھی روایت سے منحرف نہیں ہوئی بلکہ حقیقتاً وہ مسلک اسلاف کی مقلد ہی رہی، اس راہ میں سرسید کے ذہن و قلب کی استواری اور عصری تقاضوں سے باخبری ان کے کام آئی، تاہم جذبے کے صادق و مخلص ہونے کے باوجود ان کی ہر فکر اور ہر سعی کو برحق بھی نہیں کہا جاسکتا، اس کتاب کے مقالات اسی اجمال کی تفصیل ہیں جس میں تفسیر، حدیث، تعلیم و تربیت، سیاست اور تاریخ سے سرسید کے تعلق کا مطالعہ و تجزیہ محنت و دیدہ ریزی سے کیا گیا ہے، سرسید اور شاہ ولی اللہ کا موازنہ دلچسپ بحث ہے جس میں ملت اسلامیہ ہند کے دور زوال کی ان دونوں شخصیتوں کے نقطہ ہائے نظر کو واضح کیا گیا ہے، ایک عبارت یہ ظاہر کرتی ہے کہ شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں کرامات اولیاء سے انکار کیا ہے، حالانکہ انفاس العارفین میں شاہ صاحب نے کرامتوں کے نقل و بیان میں کمی نہیں کی، سرسید کی نظر میں امام رازی نے قدیم علماء کے طرز پر معجزات سے بحث کی لیکن شاہ صاحب نے اس کو تصوف کے موہوم سانچہ میں ڈھالنا چاہا، اختلاف و اتفاق کی یہ داستان پڑھنے کے لائق ہے، دیگر مقالات میں بھی محنت و توازن کی خوبیاں نمایاں ہیں، ایک مضمون میں سرسید کے ہر پہلو کو ''تقریباً کامل و مکمل'' بتایا گیا ہے لیکن

ایک اور مضمون میں حدیث اور ائمۂ حدیث کے متعلق ان کے خیالات کو نادرست اور غلط الزام سے تعبیر کیا گیا ہے، آخر میں کتابیات کا ایک مفید گوشہ بھی ہے، سرسید کے مطالعہ میں اس مجموعہ کی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، ادارۂ علوم اسلامیہ، علی گڑھ اس کے لئے شکریے کا مستحق ہے۔

**مقالات مولانا عبدالسلام ندوی، حیات اور علمی فتوحات** سمینار۔ مرتبہ جناب محمد ہارون، متوسط تقطیع بہترین کاغذ وطباعت، مجلد مع مصور گرد پوش، صفحات ۲۸۲، قیمت ۲۰۰ سو روپے، پتہ: محمد ہارون ۸/ پہلا منزلہ، ہندوستان بلڈنگ 2/10 ٹی پی اسٹریٹ ممبئی۔۴

دارالمصنفین کی شہرت کو بقائے دوام بخشنے والی شخصیتوں میں حضرت مولانا عبدالسلام ندوی کے علم وفضل کے تعارف کی ضرورت نہیں، اسوۂ صحابہ، شعرالہند اور اقبال کامل وغیرہ جیسی شاہکار تصنیفات ان کی کلاہ امتیاز کا طرۂ افتخار ہیں، تاہم یہ حقیقت ہے کہ مولانا کی شخصیت اور خدمات پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی، ایک خاص شمارے اور پی ایچ ڈی کے مقالے اور چند مضامین کے سوا مولانا کے قدردانوں کے لیے اور کچھ نہیں ہے۔ اسی احساس کے مدنظر ممبئی میں ان کے خاندانی عزیزوں نے ایک پُروقار سمینار کا انعقاد کیا جس میں ملک کے مشہور علمی وتعلیمی اداروں کے نمائندوں نے مولانا کی گوناگوں خدمات کا وقیع اور متنوع مطالعہ وتجزیہ پیش کیا، زیرنظر مجموعے میں ان مقالات کو سلیقے سے یکجا کرکے تاریخ، ترجمہ نگاری، تحقیق، ادب، انشاء پردازی، تنقید اور شاعری پر مولانا کی کامل دسترس کا ایک جامع مرقع پیش کردیا گیا ہے۔ مولانا کے سوانح پر مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے مفصل مضمون کے علاوہ آخر میں آثار عبدالسلام اور ان کی مطبوعہ وغیر مطبوعہ تصانیف کے عنوان سے مفید تحریریں بھی آگئی ہیں۔ یہ مجموعہ مولانائے مرحوم کی زندگی کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے یقیناً سب سے زیادہ مفید اور کارآمد حیثیت کا حامل ہوگیا ہے۔ کتاب کے لائق اور حوصلہ مند



مرتب اور سمینار کے ذمہ دار اس بیش قیمت علمی تحفہ کے لئے لائق تبریک وتحسین ہیں۔ افسوس ہے کہ اس تبصرہ میں قدرے تاخیر ہوگئی۔

**مطالعۂ تصنیفات مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ**، مرتبہ پروفیسر محسن عثمانی ندوی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ وطباعت، مجلد مع خوبصورت گرد پوش، صفحات ۴۹۶، قیمت ۲۰۰ روپے، پتہ مکتبہ فیض عام B1 / 8 بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی نمبر ۱۳۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی وفات کے بعد ہی سے ان کی یاد میں رسائل کے خاص شماروں اور ان کے سوانح وافکار کے متعلق کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے، زیرنظر کتاب بھی اسی کی ایک کڑی ہے، اصلاً یہ ان مقالات کا مجموعہ ہے جو دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں مولانا کی تصنیفات کے موضوع پر منعقدہ سمینار میں پیش کئے گئے تھے، مولانا ندویؒ کی تصانیف کی تعداد اردو، عربی، انگریزی اور دیگر زبانوں میں سینکڑوں سے متجاوز ہے، اردو میں یہ سو کے قریب ہیں، مذہبی حمیت، دل کی دردمندی، تاریخ پر گہری نظر اور اسلوب کی دلکشی نے مولانا مرحوم کی تحریروں کو بڑا متنوع، موثر اور جامع بنا دیا، ان کی مقبولیت بھی غیر معمولی رہی، اس کتاب میں ارکان اربعہ، نبی رحمتؐ، المرتضیٰؓ، تاریخ دعوت وعزیمت، سیرت سید احمد شہیدؒ، پرانے چراغ، نقوش اقبال اور کاروان زندگی اور دوسری کتابوں کا عمدہ مطالعہ وتجزیہ پیش کیا گیا ہے، پروفیسر وصی احمد صدیقی، مولانائے مرحوم کے قدرداں اور نمایاں کتاب شناس ہیں، ان کے کئی مضامین جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے ان کو بھی اس کتاب میں یکجا کرکے اس کی افادیت میں اضافہ کیا گیا ہے، فاضل مرتب نے صحیح لکھا کہ یہ مجموعہ کتب نما بلکہ قطب نما ہے جو اصل منزل کا پتہ دیتا ہے۔

**صدائے جرس**، از جناب ڈاکٹر مقبول احمد ایف آر سی ایس، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ وطباعت، مجلد مع دلآویز گرد پوش، صفحات ۲۴۰، قیمت درج

نہیں، پتہ: ڈاکٹر مقبول احمد، ۹۔ رپن اسٹریٹ، کلکتہ نمبر ۱۶۔

ڈاکٹر مقبول احمد صاحب، کلکتہ کے کامیاب، مشہور اور اسم بامسمی مقبول سرجن ہیں، اپنے فن اور پیشے میں انہوں نے بڑی ناموری اور نیک نامی حاصل کی، لیکن ان کی حذاقت و مسیحائی محدود نہیں رہی، ان کے حساس اور دردمند دل نے قوم وملت کے امراض ونقائص پر نظر رکھتے ہوئے اس کی صحت وتوانائی کا ہمیشہ خیال رکھا، دامے درمے قدمے سخنے وہ ہر طرح ملی مسائل سے بھی وابستہ رہے، مسلم مجلس مشاورت، مسلم یونیورسٹی، ندوہ، دار المصنفین اور دیگر اداروں سے انہوں نے عملی اور اخبارات ورسائل سے قلمی لحاظ سے رشتہ استوار رکھا، تعلیم وسیاست اور اصلاح معاشرہ کے موضوع پر ان کی تحریوں کا ایک مجموعہ ''مضامین مقبول'' کے نام سے شائع ہوا، زیر نظر کتاب ان کی سرگرم، بامقصد اور لائق تقلید وستائش زندگی کی داستان ہے جو صرف ایک سرجن کی سرگزشت ہی نہیں، زندگی کے نشیب وفراز اور سرد وگرم کا مشاہدہ کرنے والی شخصیت کی ایسی کہانی ہے جس میں بظاہر ایک عام انسان کی زندگی کے سفر کے مشاہدات وتجربات کو دوسروں کے لئے سرمایۂ ہدایت وبصیرت بنا کر پیش کیا گیا ہے، تعلیم کی اہمیت، عائلی زندگی کی نزاکت، بچوں کی تربیت اور زندگی کے اصل مقصد پر یہ تعلیمات بڑی حکیمانہ ہیں، آزادی کے بعد مسلمانوں کی سیاسی اور قومی زندگی کے ضمن میں مسلم مجلس مشاورت اور دیگر اداروں کے متعلق ایسے معلومات بھی ہیں جن کی حیثیت دستاویز کی سی ہے، خاص طور پر ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کے باب میں ان کا گہرا اور سنجیدہ تجزیہ وتبصرہ، عوام وخواص دونوں کے لئے لائق توجہ ہے، کتاب، مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب معارف کی پیش گفتار سے بھی آراستہ ہے، مضامین مقبول کی طرح یہ آپ بیتی ہر شخص خصوصاً نوجوانوں کے لئے بڑی مفید اور کارآمد ہے، اس کی پذیرائی میں شبہ نہیں۔

**الف میم**    از جناب رباب رشیدی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد مع دلکش گرد پوش، صفحات ۱۳۶، قیمت ۱۵۰ روپے، پتہ ۱۲۶،



تازی خانہ، لکھنؤ اور ۶۵۔ تارین، شاہ جہاں پور، یوپی۔

اردو شاعری کی حمد ونعت کے گراں قدر سرمایہ میں یہ مبارک مجموعہ کلام شعری لطافت، بلند خیالات اور نہایت پاکیزہ اور ہوشمندانہ روایات کے لحاظ سے ایک جدا اور منفرد حیثیت حامل ہے، جناب رباب رشیدی قادر الکلام اور پختہ مشق شاعر ہیں، اس مجموعہ میں ان خوبیوں کے علاوہ جذبات کی پاکیزگی اور مقام الوہیت اور منصب نبوت کے نازک فرق کی پاسداری کا وہ شعور بھی نمایاں ہے جس کا اہتمام عموماً کم ملحوظ رہتا ہے، یہ جذبہ بھی بڑا قابل قدر ہے کہ ''حمد ونعت کے تقاضوں کو پورا کرنا صلاحیت پر نہیں، توفیق پر منحصر ہے'' یقیناً یہ بڑی سعادت کی بات ہے۔

کبھی بھی راستے ہوتے نہیں مرے مسدود    کہ لا کے بعد جو ہے بس وہی مرا مقصود

ہے لے کر

یہ شان عمل یہ حسن عمل کردار کے روشن آئینے    دراصل انہی آئینوں سے قرآں کی وضاحت ہوتی ہے

ہر شعر کیف واثر سے لبریز ہے، چند آزاد نظمیں اور رباعیات وقطعات بھی ہیں، باطنی محاسن کے ساتھ ظاہری حسن سے بھی یہ مجموعہ پرکشش ہے۔

**وثائق یہودیت**، مترجم جناب عبدالرشید ارشد، متوسط تقطیع، کاغذ وطباعت بہتر، صفحات ۱۴۴، قیمت درج نہیں، پتہ تھنکرز فورم، الریاض، سعودی عرب۔

قوم یہود کے کید ومکر اور غضب الٰہی کو دعوت دینے والے اعمال سے صحائف وتاریخ کے اوراق سیاہ ہیں، بار بار کی ذلت ومسکنت ان کی شنیع حرکتوں کی شاہد ہے، لیکن صداقت کے انکار اور قتل وغارت گری کو اپنی عادت ثانیہ بنانے والی اس قوم کی فتنہ سامانیوں کا سلسلہ رکا نہیں، موجودہ عالمی بدامنی، سیاسی انتشار، معاشی بحران اور سماجی وعلمی وادبی فساد وفحاشی کے پس پشت یہود کی منظم کارفرمائیاں اہل نظر سے مخفی نہیں، مختلف ملکوں میں ان کی تنظیمیں مختلف خوش نما عنوان سے سرگرم فساد

ہیں، اس مختصر لیکن اہم کتاب میں ان کی دستاویزات کی روشنی میں ان کی ناپاک منصوبہ بندیوں کی ایک جھلک پیش کی گئی ہے، لائق مترجم نے واضح کیا ہے کہ یہ کتاب پہلی بار عبرانی زبان سے روسی زبان میں منتقل ہوکر ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی، انگریزی میں یہ پروٹوکولز آف دی ایلڈرز آف دی الڈرز آف صیہون کے نام سے شائع ہوئی، اس میں اقوام متحدہ، ورلڈ بینک، ڈبلو ایچ او، ڈبلو ٹی او، لائنز اور روٹری کلب وغیرہ کی شکل میں فتنہ یہود کی ہمہ گیری اور تنظیم کی جانب توجہ دلائی گئی ہے، یہودیوں کے خفیہ اجلاسوں کی کاروائی پرمبنی اس روداد کے متعلق کہا گیا کہ یہ پوری دنیا کو یہودی پولیس اسٹیٹ بنانے کے عملی منصوبے کا خاکہ ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ان چوبیس وثائق سے صیہونیت کے عزائم کا خوفناک چہرہ سامنے آتا ہے ان وثائق کی قدامت اور قطعیت سے قطع نظر ان کا سنجیدہ مطالعہ بہت ضروری ہے، لائق مترجم نے صحیح لکھا کہ یہود کا آخری نشانہ مسلمان ہیں مگر عقل و دانش اور مستعدی سے مسلمان ہی ان کے مذموم خوابوں کی تعبیر کو پراگندہ کرسکتے ہیں۔

بوئے عزیز، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۶۸، قیمت ۷۵ روپے، پتہ جناب وارث رفیع ۵۱۔ سول لائنس، بدایوں، یوپی اور مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی، ممبئی، علی گڑھ۔

اس مختصر مجموعہ کلام کے شاعر کی درخشانی شعلہ مستعجل ثابت ہوئی، ان کی ادبی وشعری صلاحیتوں کا اعتراف آل احمد سرور مرحوم اور دوسرے ہم وطن اصحاب ذوق نے کیا، جواں مرگ شاعر سے ان کو توقع تھی کہ خیال کی تازگی اور بیان کی طرفگی سے اردو شاعری میں اچھا اضافہ ہوگا، لیکن یہ حسرت ہی رہ گئی اور صرف چند غزلیں ہی ان کی عمر مستعار کا سرمایہ رہ گئیں جن کو اس مجموعے میں یکجا کردیا گیا ہے کم سہی لیکن ان اشعار میں ذوق کی تسکین کا خاصا سامان ہے۔

کوئی نہیں تھا سہارا مرا سوا تیرے    میں اعتبار نہ کرتا تو اور کیا کرتا
وہ جس پہ نام آپ کا میں نے لکھا نہ ہو    ایسا ورق نہیں کوئی دل کی کتاب کا

جیسے اشعار بتاتے ہیں کہ شاعر کی اٹھان کیسی تھی، افسوس بدایوں کے مطلع شعر و ادب پر یہ ہلال بدر کامل نہ بن سکا۔

(ع۔ص)

## دار المصنفین کا سلسلہ تذکرہ و سوانح

| کتاب | مصنف | Pages | Rs |
|---|---|---|---|
| ۱۔ الفاروق | علامہ شبلی نعمانی | 514 | 95/- |
| ۲۔ الغزالی (اضافہ شدہ ایڈیشن) | علامہ شبلی نعمانی | 278 | 120/- |
| ۳۔ المامون (مجلد) | علامہ شبلی نعمانی | 248 | 65/- |
| ۴۔ سیرۃ النعمان | علامہ شبلی نعمانی | 316 | 130/- |
| ۵۔ سیرت عمر بن عبد العزیز | مولانا عبد السلام ندوی | 196 | 32/- |
| ۶۔ سیرت عائشہؓ (مجلد) | مولانا سید سلیمان ندوی | 310 | 90/- |
| ۷۔ حیات شبلی | مولانا سید سلیمان ندوی | 922 | 160/- |
| ۸۔ امام رازیؒ | مولانا عبد السلام ندوی | - | زیر طبع |
| ۹۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی | سید صباح الدین عبد الرحمن | 30 | 10/- |
| ۱۰۔ حضرت ابو الحسن ہجویری | سید صباح الدین عبد الرحمن | 40 | 5/- |
| ۱۱۔ حیات سلیمان | شاہ معین الدین احمد ندوی | 750 | 140/- |
| ۱۲۔ مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر | سید صباح الدین عبد الرحمن | 150 | 25/- |
| ۱۳۔ تذکرۃ المحدثین (اول) | مولانا ضیاء الدین اصلاحی | 442 | 65/- |
| ۱۴۔ تذکرۃ المحدثین (دوم، جدید ایڈیشن) | مولانا ضیاء الدین اصلاحی | 472 | 160/- |
| ۱۵۔ تذکرۃ المحدثین (سوم) | مولانا ضیاء الدین اصلاحی | 432 | 70/- |
| ۱۶۔ محمد علی کی یاد میں | سید صباح الدین عبد الرحمن | 286 | 42/- |
| ۱۷۔ یاد رفتگاں | مولانا سید سلیمان ندوی | 452 | 75/- |
| ۱۸۔ بزم رفتگاں (اول) | سید صباح الدین عبد الرحمن | - | زیر طبع |
| ۱۹۔ بزم رفتگاں (دوم) | سید صباح الدین عبد الرحمن | 296 | 35/- |
| ۲۰۔ صوفی امیر خسرو | سید صباح الدین عبد الرحمن | 188 | 30/- |
| ۲۱۔ تذکرۃ الفقہاء | عمیر الصدیق دریابادی ندوی | 276 | 95/- |
| ۲۲۔ تذکرۃ مفسرین ہند (اول) | مولانا محمد عارف عمری | 172 | 60/- |
| ۲۳۔ مولانا ابو الکلام آزاد | مولانا ضیاء الدین اصلاحی | 314 | 110/- |